Monthly AWAMI JAMHURIAT
عوامی جمہوریت
ماہنامہ مارچ 2018

☆
اشاعت کا
50واں سال

برابری عورت کا حق ہے ۔ کوئی رعایت نہیں

AWP کراچی کے زیرِ اہتمام خواتین کے عالمی دن کے موقع پر ایک تقریب

سوسائٹی فار سیکولر پاکستان اور AWP کے بینر تلے کراچی میں ہونے والا سیمینار

AWP لاہور کے زیرِ اہتمام خواتین کے عالمی دن کے موقع پر ایک تقریب

AWP سانگھڑ کے زیرِ اہتمام خواتین کے عالمی دن کے موقع پر ایک تقریب

شمارہ نمبر۔2
جلد نمبر۔14

ماھنامہ
MONTHLAY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE
لاھور
عوامی جمہوریت

CPL No 279

مارچ 2018
قیمت: 30روپے

ایڈیٹر
اختر حسین
مجلس ادارت
عابد حسن منٹو
مسلم شمیم، صباالدین صبا، توقیر چغتائی،
اثر امام، عابد شکیل فاروقی
مینجنگ ایڈیٹر
اے آر عارف
سرکولیشن مینجر
اشتیاق اعظمی

اداریہ		1
۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کی قرارداد	ڈاکٹر سید جعفر احمد	3
عورت اور تبدیلی	صالحہ اطہر	7
پاکستان معاشی تباہی کے دہانے پر	نجم الحسن عطا	8
عوامی جمہوریت کے پچاس سال	ڈاکٹر شاہ محمد مری	11
18ویں ترمیم اور انتخابات	ڈاکٹر توصیف احمد	15
بھگت سنگھ کا راستہ	محمد سعید	17
یہ بہت بڑی خبر ہے	توقیر چغتائی	20
روشن خیالی سے ملائیت تک	مسلم شمیم	21
ایک نظر	رپورٹ: عابد شکیل فاروقی	23

لاہور آفس 5 میکلوڈ روڈ لاہور، پاکستان
فون: 042-37353309-37357091
فیکس: 94-42-36361531
کراچی آفس: 204-201 پینوراما سینٹر نمبر 1 فاطمہ جناح روڈ، صدر کراچی
Email:awami.jamhuriat@gmail.com

اداریہ

8 مارچ خواتین کا عالمی دن اور جدوجہد

خواتین کی جدوجہد ہزاروں لاکھوں سالوں پر محیط ہے جو پدرسری نظام کے قائم ہونے سے جاری ہے اور چونکہ اس نظام کی بنیاد ہی پیداواری آلات اور تعلقات کے بدلنے اور معاشی وسائل پر مردوں کے تسلط سے ہے لہذا ہم سمجھتے ہیں کہ پدرسری نظام کے خلاف جدوجہد ضروری ہے لیکن یہ جدوجہد محض پدرسری نظام کے خلاف ہی نہیں بلکہ اس معاشی سماجی اور سیاسی نظام کے خلاف بھی ہے جس کا محنت کش طبقے کے مرد، عورت سبھی شکار ہیں یعنی جب پورا خاندان، گاؤں گوٹھ، شہر اور ملک ہی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے قبضے میں ہو اور وہ اپنے ملکیتی نظام اور بالادستی کو قائم رکھے ہوئے ہوں اور جہاں مذہبی پادری، پنڈت، ملا تمام ہی رجعت پسندانہ قدروں کو مسلط کیے ہوئے ہوں وہاں عورت کو پدرسریت سے بچانا اور برابر معاشی وسیاسی آزادی دلانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسی طرح کے معاشی وسیاسی جبر کے شکار مردان کا ساتھ نہیں دیتے یا وہ مل کر برابر حقوق کی جدوجہد کو منظم نہیں کرتے لہذا خواتین کی جدوجہد محنت کش اور تمام محنت کار عوام کو جنس کی بنیاد پر آپس میں محاذ آرائی پیدا کرنے کے بجائے نابرابری اور موجودہ استحصالی نظام کے خاتمے کی مشترکہ جدوجہد کرنا ہوگی۔ یہ جدوجہد صنفی برابری کی جدوجہد ہے۔ ریاست کی طبقاتی ساخت اور صنفی بنیادوں کا ادراک کرتے ہوئے ہمیں ایک سیاسی پارٹی میں منظّم ہوکر چیلنج کرنا ہوگا اور پورے معاشی وسماجی نظام میں تبدیلی لانا ہوگی کیونکہ صنفی نابرابری موجودہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو بدل کر اشتراکی نظام سے ہی ممکن ہے جو سیاسی پارٹی ہی کی قیادت میں قائم ہوسکتا ہے۔

اٹھارویں آئینی ترمیم اور وفاقیت کا مسئلہ

آج کل اٹھارویں آئینی ترمیم کا مسئلہ پھر ایک دفعہ میڈیا اور عوامی سطح پر زوروں سے زیر بحث ہے اور وہ اس لیے کہ اس ملک کی سب سے بڑی طاقت ور شخصیت جناب قمر جاوید باجوہ چیف آف آرمی اسٹاف کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہیں کہ انہیں اٹھارویں آئینی ترمیم پر تحفظات ہیں اور پھر اسے شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات سے بھی زیادہ خطرناک قرار دیا۔ اب پاکستان میں چیف آف آرمی اسٹاف کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات ڈاکٹرائین بن جاتی ہے خواہ اس کی کوئی تاریخی، سماجی اور معاشی وسائنسی بنیادیں ہوں یا نہ ہوں۔

ہمارے نزدیک بنیادی مسئلہ تو پاکستان میں وفاقیت کا ہے کہ اس مملکت میں مختلف زبانوں، تہذیبوں وثقافتوں کے لوگ بستے ہیں جن کی اپنی ایک تاریخی اور جغرافیائی حدود ہیں۔ اس لیے سماجی سائنس کے اصولوں کے تحت اس ریاست کو کثیر الاقوامی اور کثیر اللسانی کہا گیا ہے جس میں طبقاتی تفریق اور اونچ نیچ موجود ہے۔ اس طرح کی مملکتوں میں دو نقطہ نظر ہمیشہ سے موجود ہیں ایک یہ کہ وفاق کو طاقت کے زور پر یعنی مضبوط مرکز کی بنیاد پر قائم رکھا جائے جس میں طاقت کا سرچشمہ فوج یا اسٹبلشمنٹ ہو اور پھر مرکز اپنی صوابدید پر صوبوں یا قومی اکائیوں کو معاشی اور سیاسی طور پر چلانے کا انتظام کرے اور دوسرا یہ کہ صوبوں یا قومی اکائیوں کا آزادانہ الحاق قائم کیا جائے ان کی قومی حدود میں تمام معاشی وسائل ان کی قدرت میں ہوں تاکہ وہاں کے عوام معاشی، سماجی وتہذیبی طور پر برابر ترقی کر سکیں اور وہ اپنے وسائل سے وفاق کو قائم رکھنے اور چلانے کا کام کریں اور انہیں اس کا احساس پیدا ہو اکہ وفاق کا قائم رہنا ان تمام کے مشترکہ مفاد میں ہے پہلا واحد نقطہ نظر نو آبادیاتی اور جدید نو آبادیاتی نظام حکومت کا ہے اور دوسرا عوامی اور قومی جمہوریتوں کا۔

پاکستان کی تاریخ کا ذرا گہرائی سے مطالعہ کریں تو ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی بنیاد ہی ۱۹۳۵ء کے آئین میں صوبائی اختیارات کی تھی کہ مسلم لیگ مسلمان اکثریت کے صوبوں کی بات کر رہی تھی لیکن اصل مسئلہ معاشی وسائل پر اختیارات کا تھا تاکہ پسماندگی کا شکار صوبے معاشی سماجی وسیاسی ترقی کر سکیں اس لیے وفاق کے اندر رہتے ہوئے خود مختار یونٹس کی بات کی گئی تھی۔

پاکستان کے قیام کے بعد ریاست قلات کے ساتھ معاہدے میں بھی وفاق کے پاس صرف دفاع، امور خارجہ اور بین الصوبائی مواصلات ہی کے شعبے دیے گئے تھے باقی معاملات میں ریاست کی خود مختاری تسلیم کی گئی تھی لیکن بعد میں پاکستانی ریاست کی جدید نو آبادیاتی تشکیل میں مضبوط مرکز کی پالیسی اختیار کی گئی۔ سندھ، بلوچستان پنجاب اور اس وقت کے شمال مغربی سرحدی صوبے (خیبر پختونخوا) کو ضم کر کے ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ بنا دیا گیا اور آبادی کی اکثریت کے اصول کو بھی ترک کر کے پاکستان کو مغربی ومشرقی پاکستان میں تقسیم کر کے نام نہاد برابری قائم کی گئی۔ ون یونٹ کو توڑنے اور آبادی کی بنیاد کے اصول کو منوانے کی جدوجہد میں ۱۳ سال لگے جس میں شیخ مجیب الرحمٰن نے چھ نکات کا پروگرام دیا جس میں دفاع اور امور خارجہ ہی مرکز کو دینے کی تجویز تھی مگر ہماری اسٹیبلشمنٹ اور جاگیر دار حکمرانوں نے زیادہ خود مختاری دینے کے بجائے پاکستان توڑنے کو ہی ترجیح دی۔

نئے پاکستان میں ۱۹۷۳ء کا آئین پاس ہوا جس کو کسی حد تک متفقہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس پر بلوچستان سے قومی اسمبلی کے رکن نواب خیر بخش مری نے دستخط نہیں کیے تھے اس آئین میں وعدہ کیا گیا تھا کہ دس سال میں مشترکہ فہرست ختم کر کے تمام اختیارات صوبوں کو دے دیے جائیں گے مگر اس پر عمل تو کجا دو دفعہ مارشل لاء لگا کر آئین ہی معطل کر دیا گیا اور آئین میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں اور خاص کر وفاقی شرعی عدالت کے باب کو داخل کر کے پارلیمنٹ کی خود مختاری ہی ختم کر دی گئی۔ ان مارشل لاؤں اور مضبوط مرکز ہی کی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ خود مختاری کے بجائے چھوٹے صوبوں کے بعض عناصر آزادی کا مطالبہ کرنے لگے ہیں اور بعض نے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

اٹھارویں آئینی ترمیم کم از کم ہماری پارلیمانی سیاسی پارٹیوں کی طرف سے پہلی سنجیدہ کوشش تھی کہ اتفاق رائے سے مشترکہ فہرست کو ختم کرتے ہوئے وسیع تبدیلیاں کیں اور صوبوں کے قدرتی وسائل پر ان کا آدھا حصہ تسلیم کیا گیا مگر اس پر عمل درآمد میں ہماری اسٹبلشمنٹ رکاوٹ ہے۔ اٹھارویں آئینی ترمیم کے ذریعے مالی وسائل کی تقسیم میں ساتویں نیشنل فنانس کمیشن (این ایف سی) ایوارڈ میں صوبوں کو 57 فیصد اور وفاق کو 43 فیصد حصہ دینے کا تسلیم کیا گیا مگر ۲۰۱۰ء کے بعد کوئی ایوارڈ اس لیے نہیں لایا گیا کہ کہیں صوبے زیادہ حصہ لینے کا مطالبہ نہ کر دیں۔ اب اسٹبلشمنٹ کے دباؤ میں وفاقی حکومت مطالبہ کر رہی ہے کہ وفاق کے حصے میں تین فیصد کا اضافہ کیا جائے تاکہ دفاعی اخراجات میں اضافے کو پورا کیا جائے۔ اس وقت تمام سیاسی پارٹیوں کو اٹھارویں آئینی ترمیم پر اس کی روح کے مطابق عمل کرانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک تو تیل، گیس، معدنیات اور تمام معاشی وسائل صوبوں کے پاس ہونے چاہئیں۔ پڑوسی ملکوں کے ساتھ دوستی اور معاشی تعلقات استوار ہوں تاکہ دفاعی اخراجات میں کمی کی جا سکے اور تاکہ تمام صوبائی یا قومی اکائیاں مضبوط ہوں۔ ان ہی اقدامات کے ذریعے وفاق سے ناراض لوگوں سے بات چیت کے دروازے بھی کھلیں گے اور رضا کارانہ پاکستانی وفاقیت قائم ہوگی۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد ــــ تاریخی اہمیت اور موجودہ افادیت

ڈاکٹر سید جعفر احمد

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شیرِ بنگال مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب کی طرف سے پیش کردہ قرارداد تاریخی اہمیت کی ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس قرارداد کو بعدازاں ''قراردادِ پاکستان'' کے نام سے موسوم کیا گیا حالانکہ اس میں پاکستان کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا تھا جبکہ اُس وقت تک پاکستان کی اصطلاح ہندوستان کے سیاسی وصحافتی حلقوں میں ایک جانی پہچانی اصطلاح بن چکی تھی۔ چوہدری رحمت علی ۱۹۳۳ء میں لندن سے شائع ہونے والے اپنے ایک کتابچے Now and Never میں پہلی بار یہ اصطلاح پیش کر چکے تھے اور ساتھ ہی انہوں نے مذکورہ کتابچہ میں اس اصطلاح کی وجہ تسمیہ بھی بیان کردی تھی لیکن چوہدری رحمت علی کے خاکے کو مسلم لیگ نے سرکاری طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو ایک اہم قرارداد پیش کرتے وقت پاکستان کا لفظ مسلم لیگ کی جانب سے اپنے مجوزہ آئینی خاکے کے لیے استعمال نہیں کیا گیا البتہ پریس نے اس قرارداد کی مجوزہ اسکیم کو تصورِ پاکستان ہی قرار دیا اور بعد میں خود مسلم لیگ نے بھی اس اصطلاح کو اختیار کرلیا۔

قراردادِ لاہور یا قراردادِ پاکستان دو اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ایک تو اس کی تاریخی حیثیت ہے۔ یہ قرارداد تاریخ کے طالب علموں پر یہ واضح کرتی ہے کہ متحدہ ہندوستان کے آئینی اور سیاسی ارتقا میں یہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس قرارداد کی دوسری اہمیت یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اس سے کس قسم کی رہنمائی اور روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس مضمون میں ہم انہی دونوں پہلوؤں سے اِس قرارداد کا جائزہ لیں گے۔ جہاں تک پہلے نکتے کا تعلق ہے، ہندوستان کے سیاسی و آئینی ارتقا کا لبِ لباب یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں پورے برصغیر پر کنٹرول حاصل کرلینے کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کا اقتدار سلطنتِ برطانیہ کے سپرد کردیا تو برطانوی حکومت نے ہندوستان کے لیے ایک طویل المیعاد انتظامی و سیاسی ڈھانچہ وضع کرنے کے بارے میں سوچ بچار شروع کی تاکہ اپنی اس انتہائی زرخیز اور قدرتی اور انسانی وسائل سے مالا مال نوآبادی پر اپنے مکمل کنٹرول کو یقینی بنا سکے۔ انگریز مدبرین نے نوآبادیاتی نظام کے استحکام کے لیے جو لائحہ عمل سوچا وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے نظم ونسق کے لیے ناگزیر ہے کہ خود ہندوستانیوں کو یہاں کے قانون سازی کے عمل اور انتظامی اُمور میں شریک کیا جائے۔ چنانچہ ایک تدریج کے ساتھ ہندوستان میں نمائندہ اداروں کے قیام کا عمل شروع ہوا۔ یہ عمل مقامی سطح سے شروع ہوکر رفتہ رفتہ صوبائی سطح تک پہنچا لیکن ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو۔ چیمسفورڈ اصلاحات اور ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے موقعوں پر ہندوستانی سیاسی عناصر کی جانب سے ہر دو دستاویزات میں تجویز کردہ مرکز سے متعلق نظام کار کو رد کردیئے جانے کے بعد عملاً ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے وقت تک مرکز میں نمائندہ ادارے قائم نہیں ہوسکے۔ اِن اداروں کی عدم موجودگی میں ہندوستان کا وفاقی نظام ایک نامکمل نظام تھا جس کے تحت صوبوں میں تو وقتاً فوقتاً انتخابات کا انعقاد اور نمائندہ اسمبلیوں اور حکومتوں کا قیام جاری رہا مگر مرکز میں ایسا نہیں ہوسکا۔ یہ ایک عجیب الخلقت وفاق تھا جس کی اس نامکمل ہیئت کو درست کرنے کی کوششیں اس پورے عرصے میں جاری رہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کی نوآبادی میں جس وفاقی نظام کا تجربہ مقصود تھا اُس کا مرکزی ڈھانچہ کیوں وضع نہیں کیا جاسکا۔ یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کی تلاش میں تاریخ کے طالب علم تقسیمِ ہند کی حقیقی وجوہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں نمائندگی اور انتخابات کے نظام کے متعارف ہونے کے نتیجے میں ہی اس خطے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جدید مفہوم میں سیاسی جمعیت سازی کا کام شروع ہوا۔ ہندوستان میں ثقافتی تنوعات تو ہمیشہ سے موجود تھے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے اور سینکڑوں زبانوں اور ہزاروں بولیوں کے بولنے والے اس خطے میں رہتے تھے اور جیسا کہ کسی بھی انسانی معاشرے میں ہوتا ہے یہاں بھی اتحاد وہم آہنگی کی مثالیں بھی موجود تھیں اور اختلاف وافتراق کے مظاہر بھی غیر موجود نہیں تھے، تاہم یہ اختلافات مستقل نوعیت کی کسی بڑی سیاسی تقسیم پر منتج نہیں ہوتے تھے۔ البتہ منتخب اداروں کے نظام کی آمد سے حلقہ ہائے نیابت اور سیاسی جماعتوں کی تشکیل، نیز انتخابی سیاست کے جو دیگر نتائج اور مظاہر ہوسکتے ہیں وہ سب سیاسی سطح پر نمودار ہونا شروع ہوئے۔ یہ اسی نمائندگی اور انتخابات کی نئی فضا میں ہوا کہ ثقافتی شناختیں، سیاسی تنظیم سازی کے لیے استعمال ہونا شروع ہوئیں اور سیاسی مفہوم میں مسلم تشخص اور جداگانہ مسلم حلقے بنائے جانے کی گفتگو شروع ہوئی۔ ہندوستان کی بعض دیگر ثقافتی اقلیتوں نے بھی اپنے لیے اسی نوع کا سیاسی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ہندوستانی سیاست میں بعد کے برسوں میں جو کردار مسلم علیحدگی پسندی (Muslim separatism) کو حاصل ہوا وہ کسی اور جداگانہ سیاسی

تشخص کے حصے میں نہیں آیا۔ بلکہ متحدہ ہندوستان میں سیاسی نزاع کی بنیاد یہی تھی کہ مسلمانوں کی سیاسی قیادت اور خاص طور سے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر جو تجاویز وقتاً فوقتاً پیش کی جاتی رہیں ان کو بالعموم کانگریس اور بعض دیگر ہندوستانی تنظیموں کی جانب سے رَد کر دیا گیا۔ شاید مسلم قیادت کی طرف سے سب سے زیادہ مصالحت کا رویہ خود قائداعظم محمد علی جناح کا تھا جو ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد ہر ہر مرحلے پر اس امر کے لیے کوشاں رہے کہ ہندوستان کے وسیع تر سیاسی نظام میں مسلم اقلیت کو قابلِ لحاظ نمائندگی دے کر ہندوستان کے لیے ایک قابلِ عمل جمہوری اور وفاقی نظام کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ کانگریس اس طرزِ فکر کو ہندوستان کے لیے نقصان دہ سمجھتی تھی اور اُس کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ سیاسی اکائی سمجھنا بجائے خود ہندوستانی وحدت کی تنسیخ ہوگی۔ کانگریس کی سیاسی قیادت جس حقیقت کا ادراک نہیں کرسکی وہ یہ تھی کہ ترقی یافتہ سیاسی نظاموں میں اقلیتوں کو اُن کے تناسب سے زیادہ نمائندگی کا دیا جانا قابلِ قبول ہوتا ہے اور یہ قومی وحدت کی ضمانت ثابت ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مسلم لیگ کی جانب سے اُن کے تناسب سے زیادہ نمائندگی اور اُن کے الگ حلقہ نیابت کی بات کی جارہی تھی تو یہ لازماً ہندوستان کی تقسیم کا نسخہ نہیں تھا۔ کسی کمیونٹی کو اُس کے عددی تناسب سے زیادہ نمائندگی کا دیا جانا علمِ سیاسیات کی زبان میں ایک ایجابی اور مثبت اقدام (Affirmative Action) کہلاتا ہے اور یہ لوگوں کو جوڑنے اور اُن کو انتشار و افتراق سے دور رکھنے کا ایک کارآمد طریقہ ہے۔ قائداعظم اور بعض دوسرے مسلم عمائدین کی جانب سے ۱۹۲۷ء میں یہاں تک پیشکش ہوئی کہ اگر تین نئے مسلم اکثریتی صوبوں کو تسلیم کرلیا جائے اور مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دے دی جائے تو مسلم لیگ جداگانہ انتخابات کے اُس موقف سے بھی پلٹ جائے گی جس پر اصرار کی خاطر ۱۹۰۶ء میں اس جماعت کا قیام عمل میں آیا تھا اور جس کو ایک مرحلے پر کانگریس کی تائید بھی حاصل ہوگئی تھی لیکن بعدازاں کانگریس کی جانب سے اس کی اس بنا پر ازسرِنو مخالفت شروع کردی گئی تھی کہ یہ ہندوستان کی وحدت کے منافی ہے۔ قائداعظم کا موقف تھا کہ اگر ہندوستان کی وحدت کانگریس کو اتنی عزیز ہے تو اُس کو مسلمانوں کے اُن مطالبات کو مان کر جو نئے صوبوں کے قیام اور مرکز میں نمائندگی کے متعلق تھے اس اتحاد کو یقینی بنالینا چاہئے اور اس کے لیے جداگانہ انتخاب کے موقف کو چھوڑنے کی مسلم لیگی پیشکش کو قبول کرلینا چاہئے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہوسکا اور ۱۹۲۷ء کی مسلم عمائدین کی یہ پیشکش کوئی سیاسی راستہ نہیں کھول سکی۔ اس واقعہ کے بعد بھی قائداعظم کی جانب سے ہر اُس تجویز میں مصالحت کا امکان دیکھا جاسکتا ہے جو اُن کی جانب سے پیش کی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد بھی جس کو بعد میں قراردادِ پاکستان کہا گیا، ہندوستان کی مکمل تقسیم کی بات نہیں کرتی۔

مذکورہ قرارداد کے اندر جو تجویز پیش کی گئی ہے وہ کسی حد تک ایک کنفیڈرل یا زونل فیڈریشن کی تجویز ہے۔ اس قرارداد میں پہلی بار زیادہ وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کو ایک اقلیت کے بجائے ایک قوم قرار دینے کی کوشش کی گئی لیکن ہندوستان کے دوسرے عوام کے ساتھ اس کے رہنے کے لیے ایک ایسا سیاسی ڈھانچہ تجویز کیا گیا جس میں مسلم اکثریتی علاقے علیحدہ سے نمایاں ہوسکتے اور یہ علاقے جو ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں واقع تھے وہاں ان کی حیثیت دو الگ وفاقوں یا علیحدہ ریاستوں کی ہوتی نیز ان وفاقوں میں شامل وحدتیں آزاد اور خودمختار ہوتیں۔ یہ قرارداد اور اس میں پیش کردہ تجویز سیاسی مطالعے کا ایک بہت دلچسپ موضوع فراہم کرتی ہے کیونکہ اس میں جہاں ایک جانب مسلم اکثریتی علاقوں کے دو گروپ یا دو آزاد ریاستیں، علیحدہ علیحدہ طور پر باور کرائی گئیں اور پھر ہر گروپ کو ایک ایسے وفاق کے طور پر پیش کیا گیا جس کی وحدتیں غیر معمولی خودمختاری کی حامل ہوتیں، وہیں دوسری طرف اس پوری تجویز کو ہندوستان کے مستقبل کے آئینی نظام کے طور پر پیش کیا گیا اور قرارداد میں یہ کہا گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کوئی آئینی نظام اُس وقت قابلِ قبول نہیں ہوگا جب تک کہ اُس کو اِس تجویز کے مطابق تشکیل نہ کیا گیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں قراردادِ لاہور مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ایک آئینی تجویز پیش کررہی تھی۔ چنانچہ اس قرارداد میں موجود ان دونوں تجویزوں یعنی اس کا پورے ہندوستان کا احاطہ کرنا اور پھر ہندوستان میں ایک سے زیادہ وفاق بنانا۔ ان دونوں کو ملا کر دیکھا جائے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ یا تو ایک کنفیڈریشن کی تجویز تھی یا اس کو ایک ایسی بڑی فیڈریشن کہا جاسکتا ہے جس کے اندر ذیلی فیڈریشنز موجود تھیں۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن پلان میں پیش کردہ تجویز قراردادِ لاہور میں پیش کردہ تجویز کے بہت قریب تھی۔ لیکن کیبنٹ مشن پلان کو کانگریس اور مسلم لیگ کی جانب سے تسلیم کیے جانے کے بعد کانگریسی صدر جواہر لعل نہرو کے ایک متنازعہ بیان کے نتیجے میں ناکامی سے دوچار ہوا اور اس ناکامی کے بعد تقسیمِ ہند کے علاوہ بظاہر اور کوئی راستہ باقی نہ بچا۔

اس پورے تناظر میں دیکھا جائے تو قراردادِ لاہور کی جو حقیقی حیثیت ہے اُس کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ قرارداد مسلم لیگ کی جدوجہد کے ایک طویل سفر میں ایک اہم سنگِ میل ضرور تھی لیکن یہ ہندوستان کو مکمل طور پر تقسیم کردینے کی تجویز نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی یہ حتمی تقسیم کیبنٹ مشن پلان کی ناکامی کے بعد ہی ممکن ہوئی۔

لیکن کیا اوپر بیان کردہ تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ قیامِ پاکستان کے بعد قراردادِ لاہور محض ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جس کا مطالعہ تاریخ کے طالب علموں کو محض اپنے معمول کے مطالعے کے طور پر کرتے رہنا چاہیے یا اس کی کوئی عملی افادیت بھی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ قرارداد میں مسلم اکثریتی علاقوں کے دو گروپوں کو متشکل کرنے کے بعد اُن کی وحدتوں کو آزادی اور خودمختاری کا جو پیغام دیا گیا تھا اُس کو ماضی کی داستان سمجھ کر نظرانداز نہیں

کر دینا چاہیے۔ بلکہ اس کو ایک مثالیہ کے طور پر یا ایک آئیڈیل سمجھ کر اپنے پیش نظر رکھا جاسکتا ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے وسیع تر ہندوستانی فریم ورک میں مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل جن دو وفاقوں کی بابت سوچا تھا اُن وفاقوں میں لیگ کے خیال میں وحدتوں کو کیا مقام حاصل ہونا تھا؟ دوسرے لفظوں میں ایک وفاق کے اندر وحدتوں کی حیثیت کیا ہوسکتی ہے، اس کے بارے میں کم از کم ۱۹۴۰ء میں لیگ کا طرزِ فکر ہم اس قرارداد کے حوالے سے جان سکتے ہیں۔ اس قرارداد میں وحدتوں کے لیے خودمختار (autonomous) اور مقتدر (sovereign) کے الفاظ استعمال ہوئے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وفاق کے اندر وحدتوں کی خودمختاری اور اُن کے مقتدر ہونے کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر وہ ایک وفاق کا حصہ ہیں تو وفاق کا مرکز کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اُس کے پاس کچھ نہ کچھ اختیارات تو ضرور ہوں گے۔ بصورتِ دیگر اُس کو وفاق کہنا ممکن نہیں اور اگر ایسا ہوگا تو پھر وحدتیں مکمل طور پر خودمختار اور مقتدر نہیں رہ پائیں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے وفاق میں وحدتوں کی خودمختاری اور اُن کا اقتدارِ اعلیٰ ایک اصولی اور نظری حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جائے گا لیکن اس کی عملی تعبیر کیا ہوگی یہ وحدتوں کو آپس میں طے کرنا ہوگا۔

شاید یہی مفہوم ہے کہ جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاکستان کی گزشتہ سات عشروں پر پھیلی ہوئی سیاسی تاریخ میں صوبائی خودمختاری کی علمبردار قوتوں نے ہمیشہ قراردادِ لاہور کو ایک مثالیہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ بدقسمتی سے آزادی کے بعد پاکستان میں جو سیاسی نظام مرتب ہوئے وہ وحدتوں کی خودمختاری اور اُن کا اقتدارِ اعلیٰ تو دُور کی بات اُن کے لیے کسی قابلِ ذکر اختیارات کے تصور کو قبول کرنے کے روادار بھی نہیں تھے۔ ان سات عشروں میں ملک میں چار مرتبہ فوجی حکومتیں برسرِ اقتدار آئیں۔ فوجی اقتدار جمہوریت کی نفی تو کرتا ہی ہے یہ وفاقی نظام کو بھی اپنے ساتھ ہم آہنگ نہیں کرسکتا۔ فوجی اقتدار معاشرتی تنوعات کے بجائے یکسانیت کو اہمیت دیتا ہے اور اس کے نزدیک یکسانیت اور اتحاد ایک ہی چیز کے دو نام ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ فوجی اقتدار جس مرکزیت پسندانہ سوچ کا علمبردار ہوتا ہے وہ کسی وفاقی نظام کے لیے سودمند نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں جب بھی فوجی اقتدار قائم ہوا اس نے قومی وحدت کی پہلے ہی سے کمزور بنیادوں کو مزید کمزور کیا اور ہر فوجی اقتدار اپنے اختتام پر ملک کو پہلے سے بڑے انتشار کے سپرد کرکے گیا۔ ایوب خان اور یحییٰ خان کے اقتدار مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوئے۔ ضیاء الحق کے زمانے میں سندھ کی وفاق سے دوری میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور جنرل مشرف بلوچستان کو ایک ایسے نازک کنارے پر چھوڑ کر گئے جہاں سے اس کو واپس لانے کے لیے بہت ہمہ گیر اور ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہوگی۔

فوجی آمریتوں کا دور ہو یا ماضی کے سویلین اقتدار کے ادوار بحیثیتِ مجموعی پاکستان میں ایک شدید مرکزیت پسندانہ نظام جاری و ساری رہا ہے۔ ملک کی تاریخ کے ابتدائی نو برس گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء ملک کا عبوری آئین بنا رہا۔ پھر ۱۹۵۶ء کا آئین وجود میں آیا جس میں مغربی خطے کے سب صوبوں اور دیگر وحدتوں کو ضم کرکے ون یونٹ تشکیل دیا گیا اور پھر اس کو مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان مصنوعی برابری کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ نظام مغربی حصے کے سابقہ چھوٹے صوبوں اور بلوچستان ہی کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا بلکہ مشرقی پاکستان بھی ذہنی طور پر اس کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ۱۹۶۲ء کے دستور نے بھی اسی نظام کو برقرار رکھا۔ ۱۹۷۰ء میں مغربی حصے کے سابق صوبے تو بحال ہوگئے لیکن ۱۹۷۱ء کے انتخابی نتائج کو اس وقت کی فوجی حکومت اور مغربی پاکستان کے روایتی سیاسی مقتدر حلقے قبول نہیں کرسکے جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کے حالات فوجی انتظامیہ کے ہاتھوں سے نکلتے چلے گئے اور پاکستان دولخت ہوا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا بنیادی سبب اُس صوبے کی عددی برتری کو تسلیم کرنے سے پاکستانی حکومتوں اور مقتدرہ کا انکار، مشرقی پاکستان کا اقتصادی استحصال، اُس کو ایک صوبے کے بجائے ایک نوآبادی کے طور پر برتنے کا ہمارا مجرمانہ کردار اور بنگالی عوام اور ان کے زبان و ادب کو کمتر درجے کا حامل تصور کرنے کا ہمارا رجحان تھا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ۱۹۷۳ء کے دستور میں پاکستان میں نمائندگی کے مسئلے کو تو کسی حد تک طے کرلیا گیا لیکن ۱۹۷۳ء کا دستور بھی صوبائی خودمختاری کے نقطۂ نظر سے کوئی قابلِ اطمینان فریم ورک فراہم نہیں کرسکا۔ یہی نہیں بلکہ اس دستور کے بننے کے بعد دو فوجی آمروں نے اس کو معطل بھی کیا جس کا براہ راست اثر چھوٹے صوبوں میں احساسِ محرومی کے فروغ کی صورت میں نکلا۔

۱۹۷۳ء کا دستور مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے حوالے سے جو نظام کار فراہم کرتا تھا اُس میں مرکزیت پسندی کا رجحان غالب تھا۔ اس دستور میں کم و بیش تمام اہم موضوعات اور مضامین اور قانون سازی کے اختیارات مرکز کو فراہم کرکے چند غیر اہم اختیارات صوبوں کے لیے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ خاص طور سے مادّی وسائل اور اُن پر فیصلہ سازی کا تقریباً سارا ہی کنٹرول مرکز کا تھا۔ اس لحاظ سے صوبے زیادہ سے زیادہ مرکز کے فیصلوں پر عمل درآمد کروانے کی ایجنسیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کو اُس وقت کی حزبِ اختلاف سے تعلق رکھنے والے سیاست دانوں نے اس بنا پر قبول کرلیا تھا کہ اُن کے خیال میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ملک زیادہ عرصہ دستور سے محروم رہنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اُس وقت کی حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار میں اس حوالے سے بھی اتفاق رائے موجود تھا کہ مستقبل میں صوبوں کے اختیارات میں اضافہ کیا جائے گا اور دستور میں موجود مشترکہ فہرست دس سال بعد ختم کردی جائے گی تاکہ اس میں موجود اختیارات بھی صوبوں کے سپرد ہوجائیں۔ دستور کی منظوری کے بعد نہ صرف یہی وعدہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا بلکہ دستور کے فراہم کردہ دیگر ادارے جو اس کے وفاقی نظام میں ایک کلیدی

حیثیت رکھتے تھے، اُن اداروں کی کارکردگی بھی انتہائی مایوس کن رہی۔ چنانچہ نہ تو این ایف سی ایوارڈ دستور کے طے کردہ شیڈول یعنی ہر ۵ سال کے بعد تشکیل پا سکا بلکہ ایک اور ادارہ یعنی کونسل آف کامن انٹرسٹ بھی تقریباً عضوِ معطل بنا رہا۔ حالانکہ اس کونسل کو دستور نے اہم ذمہ داریاں سونپی تھیں۔ دستور کی طرف سے مختلف حکومتوں کی لاتعلقی اور اس میں جیسا بھی وفاقی نظام تجویز کیا تھا اُس کو حقیقی معنوں میں روبہ عمل لانے میں تساہل ہی ہے جس نے چھوٹے صوبوں میں ایک طرح کا احساسِ بیگانگی اور احساسِ لاتعلقی پیدا کر دیا ہے۔

یہاں اس امر کا اعتراف کرنے میں بھی ہمیں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے کہ پاکستان میں صوبائی خودمختاری کے نقطۂ نظر سے اگر کوئی قابلِ ذکر پیش رفت ہوئی ہے تو وہ ۱۸ ویں ترمیم کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ اس ترمیم پر مختلف حلقوں کی جانب سے تنقیدی آراء بھی سامنے آئی ہیں چنانچہ بعض روایتی مرکزیت پسند حلقے اس میں دی گئی صوبائی خودمختاری کو پاکستان کی تباہی اور قومی وحدت کے خاتمے کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ بعض قوم پرست حلقے اس کو اس خیال سے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے کہ اُن کی دانست میں مسئلہ اب صوبائی خودمختاری کے موضوع سے کہیں آگے نکل چکا ہے۔ قوم پرست حلقوں کی طرف سے اس سوال کا اُٹھنا بالکل بجا ہے کہ جب ماضی میں دستور کو بڑی آسانی سے توڑنے کی روایت موجود ہو تو اب آئین کے ذریعے کسی وعدے وعید کی کیا اہمیت ہے۔ ان حلقوں کا کہنا ہے کہ جو آئین اپنی حفاظت نہ کر سکے وہ ہمیں تحفظ کس طرح سے فراہم کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں جہاں ایک طرف مرکزیت پسندانہ سوچ رکھنے والے لوگوں کو یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ صوبوں پر اعتماد کریں کیونکہ وہ صوبے ہی ہیں جنہوں نے پاکستان کو تشکیل دیا ہے۔ وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ قوم پرست حلقوں کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی جائے اور پورے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اُن پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی جائے کہ پاکستان میں سیاسی عمل کے اندر اُن کی شمولیت ہی وہ راستہ ہے جو جمہوری قوتوں کو مضبوط کر کے دستور کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ اگر ملک میں سیاسی اور جمہوری عمل تقسیم در تقسیم کا شکار رہا اور بنیادی جمہوری قدروں اور اداروں پر اتفاقِ رائے کی صورت پیدا نہیں ہوئی تو دستور کو تحفظ فراہم کرنے والے اسباب بھی میسر نہیں آئیں گے اور غیر جمہوری قوتیں ماضی کی طرح آئندہ بھی من مانی کرتی رہیں گی۔

دستور میں ۱۸ ویں ترمیم نے چند خوش آئند باتوں کی نشاندہی ضرور کی ہے۔ ایک اچھا پیغام تو یہ سامنے آیا ہے کہ باوجود شدید قسم کے باہمی اختلاف کے، ہماری سیاسی قیادت نے کم از کم اتنی بلوغت کا مظاہرہ ضرور کیا ہے کہ پارلیمان کے ذریعے دستور میں ایسی تبدیلیاں کی گئی ہیں جن پر ایک طرح کا قومی اتفاق موجود تھا۔ جس ۲۷ رُکنی کمیٹی نے ۱۸ ویں ترمیم کا مسودہ تیار کر کے پیش کیا اُس نے بڑی محنت سے کوئی ۱۰۴ ترامیم دستور میں تجویز کیں جن کے نتیجے میں بنیادی حقوق کا دائرۂ کار وسیع ہوا، پارلیمانی نظام بحال ہوا اور سب سے اہم بات یہ کہ صوبائی خودمختاری کی سمت میں ایک اہم پیش رفت ہوئی۔ ۱۸ ویں ترمیم نے مشترکہ فہرست کو ختم کیا جس کے نتیجے میں کوئی ۳۴ شعبے اور ذمہ داریاں صوبوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ اس کے ساتھ مرکز کی ۱۷ وزارتیں ختم کر دی گئیں جو کہ بجائے خود ایک بہت بڑا اقدام تھا جس سے ۷۷ ہزار ملازمین متاثر بھی ہوئے لیکن ان میں سے بیشتر کی اب تک کہیں نہ کہیں تعیناتی کر دی گئی ہے اور اُن کی ذمہ داریاں دوسری وزارتوں کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ کچھ لوگ ابھی دوسری ذمہ داریاں ملنے کے انتظار میں ہیں لیکن ان میں سے بے روزگار کسی کو نہیں کیا گیا ہے۔ ۱۸ ویں ترمیم ہی نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ قومی مالیاتی ایوارڈ سے کسی بھی صوبے کو جو بھی حصہ دیا جائے گا وہ اُس کو پچھلے ایوارڈ سے ملنے والے حصے سے زیادہ تو ہو سکتا ہے، اُس سے کم نہیں ہوگا۔ ۱۸ ویں ترمیم سے ذرا پہلے ساتویں این ایف سی ایوارڈ کا اعلان ہو چکا تھا اور اُس ایوارڈ میں ایک اور اہم فیصلہ ہوا تھا جس کی رُو سے قابلِ تقسیم محاصل کے پول سے صوبوں کو ملنے والے حصے کا تعین ماضی کی طرح صرف آبادی کی بنیاد پر نہیں ہوگا بلکہ اب دوسرے معیارات بھی پیش نظر رکھے جائیں گے جس میں صوبوں کی پسماندگی، اُن کے رقبے کی وسعت اور اُن کی طرف سے محاصل اکٹھا کرنے کے عوامل بھی پیش نظر رکھے جائیں گے۔ اٹھارویں ترمیم کا یہ فیصلہ بھی خوش آئند ہے کہ اب کسی بھی صوبے کے معدنی اور ساحلی وسائل مرکز اور اُس صوبے کی مشترکہ ملکیت تصور ہوں گے۔

ساتویں این ایف سی ایوارڈ اور ۱۸ ویں ترمیم نے صوبائی خودمختاری کے حوالے سے ایک اُمید افزا ماحول پیدا کیا ہے لیکن اس کو اس سمت میں حرفِ آخر نہیں بننا چاہیے۔ پاکستان میں جمہوریت اور وفاقیت کے فروغ اور استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اختیارات مرکز سے صرف صوبوں تک آ کر رُک نہ جائیں بلکہ صوبوں سے نیچے پہنچ کر مقامی سطح تک رسائی حاصل کریں۔ جب تک مقامی سطح پر وسائل اور اختیارات کی تقسیم منصفانہ طور پر نہیں ہوگی تب تک معاشرے کے اندر بے چینیاں برقرار رہیں گی اور ناآسودہ حلقے قومی وحدت کے تصور کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑے رہیں گے۔

پاکستان میں جمہوریت اور وفاقیت کی روح کا سیاسی عمل میں جاری و ساری رہنا ملک کے اتحاد و استحکام کی واحد ضمانت فراہم کرتا ہے۔ ایک متنوع معاشرہ جس میں ثقافتی اور تہذیبی تنوعات کثرت سے پائے جاتے ہوں اور جہاں اپنی زبان، ادب، ثقافت اور اپنے حقوق کے حصول کا شعور غیر معمولی طور پر پایا جاتا ہو وہاں لوگوں کو محض خوش نما نعروں اور مسحور کن نغموں کے ذریعے یا پھر جبر کے ہتھکنڈوں کو استعمال کر کے متحد نہیں رکھا جا سکتا۔ عوام معاملہ فہم ہیں اور وہ معاملات کو ٹھوس بنیادوں پر اور منصفانہ افہام و تفہیم کے ذریعے حل ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ شاید یہی روحِ عصر بھی ہے جس کی تفہیم کم از کم ۱۹۴۰ء میں ہماری سیاسی قیادت کو ضرور حاصل تھی۔ کیا آج کی سیاسی قیادت کو بھی یہ تفہیم حاصل ہے؟ اس سوال کا جواب اُسی کو دینا چاہیے۔ ☆☆

عورت اور تبدیلی

صالحہ اطہر

ہم سب ایسی دنیا کی خواہش کرتے ہیں جس کی بنیاد مساوات انصاف عزت امن پر ہوتا کہ معاشرہ میں رہنے والے عورتوں اور مردوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور تشدد ختم ہوجائے لیکن ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔

دنیا بھر میں زیادتی Violence تشدد اپنے کئی رخ وقسموں کے ساتھ موجود ہے مثلاً نا انصافی غیر مساویانہ سلوک غیر انسانی سلوک استحصال پدرسری نظام غیرت کے نام پر قتل فرسودہ رسم ورواج۔ Violence کرنے والے بھی مختلف حیثیتوں میں موجود ہیں مثلاً پدرسری معاشرہ مردوں کی بالادستی مذہبی پابندیاں فرسودہ رسومات Customary laws جاگیردار سرمایہ دار مراعات یافتہ طبقہ۔

ایسے ہی معاشرہ میں عموماً نا انصافی اور زیادتی اور تشدد کا جنم ہوتا ہے غیر مساویانہ سلوک کو پروان چڑھایا جاتا ہے استحصال بڑھ کر اپنے انتہا کو پہنچ جاتا ہے مراعت یافتہ طبقہ بہت طاقت ور ہوجاتا ہے زندگی گزارنے کی قدریں مختلف ہوجاتی ہیں ان مسائل کا شکار مرد اور عورت دونوں ہی ہوتے ہیں ان مسائل سے چھٹکارے کی کوئی شکل نظر نہیں آتی مرد اور عورت کے درمیان حیثیتی اعتبار سے بہت فرق پیدا ہوگیا ہے مرد نے اپنی بالادستی کی شان میں ان رکاوٹوں کو دور کرنے کا کبھی نہیں سوچا وہ سمجھتا ہے کہ یہ پابندیاں عورتوں کے لیے بجا ہیں اب یہاں دیکھیں کہ عورت ڈبل مسائل کا شکار نظر آتی ہے اپنے اور مرد کے تعلقات کے ساتھ معاشرتی مسائل کے ساتھ جس کا مرد بھی شکار ہے۔

دیکھا جائے تو مرد کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں مثلاً نا انصافی ' استحصال' طبقاتی نظام غیر مساویانہ سلوک سے وہ خود پریشان ہے ساتھ ساتھ جبر ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے وہ ایسے معاشرے کی جدوجہد کرتا ہے جس میں سب انسان برابر ہوں اور دنیا کے مادی وسائل پر بلاتمیز مذہب رنگ ونسل جنس اور قومیت سب کا برابر کا حق ہو اور وہ پاکیزہ یا غیر استحصالی معاشرہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور آواز بلند کرتا ہے کہ ہر فرد کو اس کا حق ملے ایسے معاشرہ کی امید کرتا ہے کہ ہر فرد اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی آزادانہ نشوونما کے مواقع کی ضمانت دی جائے۔

جب ہر ذی شعور مرد ایسا معاشرہ تشکیل دینے کا سوچ سکتا ہے اور ایسے معاشرے کی مطالبہ کرتا ہے جس میں اسکے لیے جبر اور ظلم نہ ہو تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اپنے اور عورت کے ساتھ وہی تعلقات رکھے جس کی وہ مخالفت کرتا ہے وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ عورتیں طبقاتی استحصال کے ساتھ ساتھ صنفی استحصال کا شکار ہورہی ہیں اور وہی ظلم جبر عورت پر روا رکھتا ہے کچھ ایسا لگتا ہے کہ مرد نے یہ سمجھ لیا کہ عورت کے لیے جو سماج مذہب نے طے کیا ہے وہ صحیح ہے کیونکہ یہ طریقہ برسہا برس سے چلا آرہا ہے یہی رہنا چاہیے اور یہ بھی نہیں کہ کوئی تبدیلی آئے اس کو ڈر ہے کہ شاید وہ پھر کمزور ہوجائے گا

دنیا بھر میں مرد عورت کے حقوق اور کام برابر اور یکساں مانے جاتے ہیں مرد عورت کے حقوق بھی ایک ہیں ان کے درمیان فرق انسان نے اپنی جامد ساکت نظریات کی بنیاد پر رائج کیا اپنی بالادستی کو برقرار رکھتے ہوئے کمزور پر اپنی طاقت کا استعمال کرتا ہے پھر مرد نے اپنی غیرت اور عزت عورت سے منسلک کرلی۔ جس طرح پرانی دیومالائی کہانیوں میں جن بھوت کی جان طوطے میں اٹکی ہوتی ہے پھر وہ اس کی حفاظت کے انتظامات کرتا ہے کہ کسی کی اس پر نظر نہ پڑے کوئی اس کے قریب نہ جائے کچھ یہی حال ہمارے معاشرے میں عورت کا ہے جس کو مرد چادر چاردیواری میں رکھتا ہے کسی کی نظر نہ پڑے کسی کے سامنے نہ چلی جائے اگر چلی گئی تو اس کی عزت غیرت پر زد پڑتی ہے اور وہ ماردی جاتی ہے یا دیکھنے والا اپنی جان سے جاتا ہے۔

معاشرے میں مردوں کے ان رویوں کی وجہ سے اس کے تیار کردہ امتیازی قوانین مردانہ برتری اور جنسی استحصال کی وجہ سے عورت پسماندگی سیاسی وسماجی حقوق سے محروم ہوتی چلی گئی عورت ریاستی جبر اور مرد کے بنائے ظلم وجبر کا شکار ہوتی ہے اس عمل کو جاری رکھنے میں ہماری رسومات معاشرے میں رائج جامد وساکت نظریات اور اس کو پروان چڑھانے والی سیاسی جماعتیں پیش پیش ہیں اسلامائزیشن کے نام پر عورتوں کو مردوں کی بالادستی کا غلام بنادیا ہے اور یہ بالادستی عورت کو ورثے میں ملی ہے اس کو زندگی کا ہر فیصلہ مرد کی رضامندی سے طے کرنا ہوتا ہے بورژوا سماج نے مرد اور عورت کے درمیان کام کی تقسیم کردی عورت کے لیے گھر کی چاردیواری کے اندر کام تفویض کردیا مرد کا کام صرف کما کر لانا رہ گیا۔ اس تقسیم میں توازن نہیں کیونکہ عورت کے کام کے اوقات مقرر نہیں تقریباً چوبیس گھنٹے لیکن اس کے کام کو گنا نہیں جاتا جبکہ مرد کے کام کے اوقات صرف آٹھ یا نو گھنٹے۔ محنت میں شمار کیا جاتا ہے یہ بھی بہت بڑی نا انصافی ہے عورت پر ظلم ہے۔ عورت اور مرد کی اجرت میں بھی فرق روا رکھا جاتا ہے عورت کام مرد سے زیادہ کرتی ہے مگر اجرت میں کم اجرت شمار کی جاتی ہے دیہات کی عورت بھی اسی طریقہ کا شکار ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں گلوبلائزیشن کی پالیسی کے نتیجے میں رسمی کام بڑی تیزی سے غیر رسمی کام میں منتقل ہوگیا ہے خصوصی طور پر گارمنٹ ٹیکسٹائل چوڑی (باقی صفحہ ۱۰ پر)

پاکستان معاشی تباہی کے دہانے پر

نجم الحسن عطا

صنعت اور ٹیکنالوجی کی جدید دنیا نے تجارت کے پرتوں میں کئی گنا اضافہ کردیا ہے۔ اشیائے صرف میں خام مال مصنوعات کی تجارت اوراشیائے سرمایہ میں مشینوں کی تجارت' ٹیکنالوجی میں کمپیوٹر اور ڈیجیٹل تجارت' قرضوں اور دیگر ٹیکنالوجیز کی تجارت اشیائے ثقافت یا کوچہ ثقافت فن اورادب کے علاوہ جنگوں کی تجارت غرض کہ ضمیر کی تجارت، جھوٹ کی تجارت ان تمام صورتوں کی قوت محرکہ ایجادیں ٹیکنالوجی یا ذہانتی پراپرٹی کی جدتیں تو ہیں لیکن ہوس اورلوٹ مار بھی ہے جس نے حقیقی اور غیر حقیقی تجارت جوئے کے ذریعے (اسٹاک مارکیٹس اور کیسنو) کرنسی کی تجارت سٹہ بازی سے اراضی کی تجارت لیکن پھر بھی دیکھیے یہ سب کچھ سرمایہ داری نظام میں منافع کے لیے ہونا مثلاً اسلحہ کی تجارت اور پراکسی جنگیں، ڈرگ کی تجارت، کمرشل ازم سے کمانا ہے، پاک ناپاک سب برابر ہوگئے اس نظام میں بچوں اور خواتین کی تجارت روح کے زخم مندمل ہونے نہیں دیتے قلم کی تجارت جہاں کہا جاتا ہے لایعنی لکھا جائے فلم وادب بے معنی نئی نسل کو روبوٹ بنایا جائے فاسٹ فوڈ کھلایا جائے ذوق اور ذائقہ تبدیل کرنے کی تجارت اور سازش پھر جو حقیقی لین دین ہوتا ہے وہ بھی ضروری ہے چاہے وہ ایمانداری سے نہ ہو پاکستان میں بے ایمانی کے ساتھ ملاوٹ بھی تجارت ہے کہتے ہیں ذہانتی پراپرٹی کی سطح درست نہ ہو تو ذرائع معاش کی ہر قسم جائز سے ناجائز اور پاک سے ناپاک کی طرف سفر کرنا شروع کردیتی ہے سفر کی اس ناجائز سمت میں ایمانداری کم ازکم اور بددیانتی زیادہ سے زیادہ شامل ہوتی چلی جاتی ہے۔ معاش کے جائز طریقوں کے ناجائز میں بدلنے کی بنیادی میکانیت ذہانتی پراپرٹی یا ذہانتی اثاثوں کا وسائل معاش سے بنیادی تعلق یوں پیدا ہوتا ہے کہ دریافت یا ایجاد جس ملک میں پیدا ہوتی ہے وہاں روزگار کے بہت سے بند راستے کھول دیتی ہے مثلاً ریل کا انجن ایجاد ہوا تو اس سے روزگار کے سیکڑوں شعبے وجود میں آئے انجن کے لیے درکار لوہے کی کان کنی دھات کو انجن میں بدلنے کے کارخانے، انجن میں استعمال ہونے والے سامان کے کارخانے، ریل کا نظام چلانے کا عملہ، نقل حمل سے مارکیٹ سرگرمیاں یعنی ایک ایجاد سے روزگار کے کئی راستے کھل جاتے ہیں اور جو ملک دریافت نہ کرسکے ایجاد نہ کرسکے تو ایسے ملک میں بیروزگاری اور غربت اپنی جائز محنت سے محروم بیروزگار افتادگان خاک بدنصیب ڈاکے قتل عام چوری اور فراڈ جیسے ذرائع کی طرف دھکیل دیے جاتے ہیں۔

دیکھیے اور سوچیے یہ معاشی اصول ہے جب دولت چند ہاتھوں میں مرتکز اور جمع ہوجاتی ہے تو یاد رکھیے کہ مسابقانہ نظام ختم ہوجاتا ہے وہ جن کے پاس ٹنوں کے حساب سے کاغذی کرنسی ہوتی ہے انہیں اس کی پروانہیں ہوتی کہ درآمدات زیادہ ہیں یا برآمدات کرنسی گر رہی ہے یا اس کی قدر بڑھ رہی ہے ملک کے عوام بیروزگار ہیں یا برسرروزگار۔ ان کو اس کی پروانہیں ان کے اپنے کھاتے سونا چاندی اور عیاشی میں خلل نہ پڑے پھر جہاں منافع ہو وہ ان کا گھر ہوتا ہے اس لیے وہ ملک نچوڑتے ہیں سرکاری معیشت دان 88.9 ارب ڈالر کے بیرونی قرضوں چین کے 160 ارب ڈالر کے قرضوں اور تجارتی خسارہ 33 ارب ڈالر کے درمیان کھڑے کہتے ہیں کہ پاکستان ترقی کررہا ہے دکھ بھری داستان یہ ہے کہ ہمارا سالانہ عالمی تجارت میں حصہ 0.01 فیصد ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے اگر گلوبل تجارت میں ہمارا حصہ نصف فیصد سے کم ہوتو ملک کے اندر ملکی مقامی تجارت اور ان کے پروڈکس کی فروخت کم ہوتی چلی جاتی ہے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ عالمی تجارت میں نہ تو ہماری استعداد کار بہتر ہے نہ ہی ہم اس قابل ہیں کہ دوسری اقوام کا مقابلہ کرسکیں اسی لیے ہماری درآمدات 21 ارب ڈالر جبکہ ویتنام کی 160 ارب ڈالر ہے کاروباری حلقوں اور حکومت کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو دور کریں اس کے بجائے ایک دوسرے کو موردالزام ٹھہراتے ہیں گزشتہ چار سالوں میں پاکستان کی برآمدات

اور روپے کی قدر گر رہی ہے اسحاق ڈار باہر چھپ گیا ہے سچا انسان بھاگتا نہیں پھانسی چڑھ جاتا ہے ذوالفقار علی بھٹو کی مثال بے مثال ہے پاکستان کے لیے انمول ہے۔

موجودہ حکومت ابھی برآمدات میں اس ہدف تک بھی نہیں پہنچی جو 2012-13 میں حاصل کیا گیا تھا (26 ارب ڈالر) وہ ملک جس کے کرتا دھرتا یہ کہتے ہیں کہ ہم 2025 تک دنیا کی 25 ویں بڑی معیشت بن جائیں گے یہ شرم کی بات ہے کہ گزشتہ پانچ سال میں برآمدات میں اضافے کی شرح صفر رہی ہے حالانکہ پاکستان قدرتی وسائل سے مالا مال ہے کسی ملک کے پاس نہ ہی اس قدر نوجوان افرادی قوت ہے جو معیشت کو چلائے لیکن ان کی اکثریت ڈگریاں لے کر بھٹک رہی ہے اسی لیے انسانی اسمگلنگ اور جرائم زوروں پر ہیں چین جو اس وقت عالمی سطح پر بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے اس کا سب سے بڑا مسئلہ نوجوان ورکرز کی کمی ہے، سی پیک تعمیر ہو رہا ہے پاکستان کے اہل بست و کشاد نے اتنا بھی نہیں کیا کہ اپنے نوجوانوں کو تربیت کے لیے چین بھیجیں۔ سب سے قریب گلگت بلتستان ہے وہاں سے بھی بھیج دیتے ادھر مکران کے ساحل کے قرب و جوار میں غربت پھیلی ہوئی ہے یہاں سے افرادی قوت بھیجتے سرائکی علاقہ اندرون سندھ' کراچی کے مضافات' پنجاب کے پسماندہ علاقے اور کے پی کے سے لاکھوں لوگوں کو کم از کم تربیت کے سلسلے کو سی پیک کا حصہ بناتے تب بھرپور فائدہ ہوتا، ملائیشیا میں محنت کشوں کی کمی ہوگئی وہ اپنی انڈسٹری کو چلانے کے لیے بیرون ملک سے لوگوں کو منگوا رہا ہے مشرق وسطیٰ کی مثال پیش ہے جہاں لاکھوں پاکستانی محنت کش کام کر کے 18 ارب ڈالر کی سالانہ ترسیلات زر بھیج کر پاکستان کے دونمبری ٹیکس چوروں کے منہ پر طمانچہ رسید کر رہے ہیں۔

پاکستان میں دو شعبوں پر زور دیا گیا ہے ایک سیمنٹ فیکٹریاں بنائی گئی ہیں دوسرا شوگر ملوں کی بہتات ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فاضل پیداوار کو برآمد کر کے سرمایہ دار زرمبادلہ کماتے ہیں اور زیادہ تر زرمبادلہ باہر ہی رہتا ہے ملک میں دونوں اشیاء مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں اور شوگر مل مالکان کسانوں سے گنا درست قیمت اور درست وقت پر نہیں خریدتے یہ بھی دیکھیے کہ ان دونوں شعبوں میں پرانے سرمایہ دار ہی سرمایہ داری کرتے ہیں کسی نئے سرمایہ دار کو آنے نہیں دیتے سیمنٹ انڈسٹری ۱۹۹۷ء میں تقریباً ایک کروڑ ٹن سیمنٹ پیدا کرتی تھی دو ڈھائی عشروں بعد بھی اس کی پیداوار میں پانچ گنا اضافہ ہوا ہے اس وقت 46.70 ملین ٹن سیمنٹ پیدا کیا جا رہا ہے لیکن فیکٹریاں اتنی ہی ہیں یعنی صرف 23 فیکٹریاں کام کر رہی ہیں اور ان دونوں شعبوں کے مالکان نوٹوں کی بوریاں بھر رہے ہیں اتنے زبردست منافع کے باوجود کسی نے یہ تجزیہ کیا ہے کہ کوئی نیا سرمایہ دار ان دونوں شعبوں میں نہیں آیا چونکہ پاکستان کے طاقتوروں کی اجارہ داری ہے یہ سرمایہ دار پورا الیکشن خرید سکتے ہیں اگر وطن پرست ہوتے تو یہ قرضے ختم کر سکتے ہیں لیکن ان کی دولت تو باہر بہت زیادہ ہے جس سے بیرونی ملک فائدہ اٹھا رہے ہیں پاکستان میں ان دونوں شعبوں میں کارٹل بنے ہوئے ہیں اور اپنی مرضی سے قیمت فروخت اور قیمت خرید (گناہ وغیرہ) مقرر کرتے ہیں یہ اشرافیہ کی معیشت ہے اس لیے کوئی نیا چہرہ اس میں آنے کی کوشش نہیں کرتا تو پھر ملک کہاں کھڑا ہوگا اور کون چلائے گا؟ اس ملک میں ایک زمانے میں بائیس خاندانوں کا راج تھا تو وزیر خزانہ محبوب الحق ان کے خلاف چیخ اٹھا تھا اور اب پانچ سو سے زیادہ بڑے بینکوں، ٹیکسٹائل ملوں پاور پلانٹس گارمنٹس کارکانے سیمنٹ' شوگر ملز ایوی ایشن وغیرہ پر قابض ہیں ملک پسماندہ ہے اور ان ملوں کے مالکان دنیا کے مالداروں میں شامل ہو رہے ہیں اسی لیے ہماری برآمدات گھٹ رہی ہیں اور درآمدات بڑھ رہی ہیں کیونکہ باہر سے ٹیکنالوجی امپورٹ نہیں ہو رہی تعیش کی اشیا کے ساتھ چند ممالک چلانے کے لیے اشیا جن میں تیل سرفہرست ہے منگوایا جا رہا ہے دولت چند سو خاندانوں میں مرتکز ہوگئی ہے دونمبری اور ٹیکس چور ۳۵ لاکھ افراد کے قریب ہیں اس لیے نئی نئی بڑی بڑی گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آ رہی ہیں اور روپے کی قدر گرتی جا رہی ہے اس کی کسی کو پروا نہیں وزارت تجارت نے اس بارے میں کچھ نہیں کیا کیونکہ دیگر وزارتیں مداخلت کرتی ہیں۔ ایف بی آر ڈیوٹیز یا ٹیکس پاکستان کی ضرورت کے مطابق نافذ نہیں کرتا بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ بجٹ کا خسارہ کیسے پورا ہو اسی لیے بجلی مہنگی اور برآمد کنندگان مقابلے کے قابل نہیں رہے اور پانی کی بھی قلت ہے موجودہ حکومت یا اپوزیشن کے کسی لیڈر نے ان

مسائل کا ذکر اپنی تقریروں یا بیانات میں نہیں کیا کوئی نہیں ہے جو آزاد تجارتی پالیسی بنا سکے بجلی کے نرخ کم کر سکے جس میں میں لائن لاسز میں 32 فیصد نقصان اٹھایا جا رہا ہو وہاں پاکستان کو طویل مدت کا حل چاہیے تاکہ بیمار معیشت کو چلنے کے قابل بنایا جا سکے ہماری برآمدی بنیاد بہت کم ہے صرف 10 فیصد پروڈکٹس 80 فیصد درامدات کھا جاتے ہیں اور ایکسپورٹ کا انحصار اسی فیصد ٹیکسٹائل پر ہے اس کے بعد چاول' چمڑا آتا ہے پاکستان 70 فیصد برآمدات امریکہ یو اے ای اور مشرق وسطیٰ میں کرتا ہے مارکیٹیں تلاش نہیں کی جاتیں ہم نے افریقی ریاستوں' وسطی ایشیائی ریاستوں روس اور مشرق بعید کو بالکل نظر انداز کر رکھا ہے ملک کو ترقی دینے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے وفاقی حکومت کے خلاف آپٹا نے بہت احتجاج کیا ہے لیکن غیر سنجیدگی دیکھیے وہ صوبائی حکومت کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ٹیکسٹائل شعبہ کو انرجی بحران سے نکالیں اور فی یونٹ اس کی قیمت کم کریں جتنے بھی ری فنڈ اور ری بیٹ ہیں ان کی واپسی کا انتظام کریں اندازہ کیجیے یورپ نے جی ایس پی سہولت واپس نہیں کی اس کی تجدید کر دی ہے لیکن پاکستان اس سے پہلے کوئی فائدہ اٹھا سکا نہ اب اٹھا سکے گا۔ کیونکہ پاکستان کے عوام اور معیشت سے کسی حکمران کو دلچسپی نہیں ہے ادھر خبر یہ ہے کہ پچھلے دو ماہ سے مینوفیکچرنگ کا شعبہ سکڑ گیا ہے اس کی گروتھ 1.4 فیصد منفی جا رہی ہے موجودہ مالیاتی سال میں احسن اقبال جیسے دانشور سے آس لگائے بیٹھے ہیں کہ 5.5 فیصد شرح نمو ہوگی اگر یہ حالت بدستور جاری رہی تو آئندہ جو حکومت کرے گا اس ملک کے لیے عذاب تو بنے گا ہی لیکن عوام کی حالت مزید خستہ ہو جائے گی کے پی کے اور سندھ میں گنے کی پیداوار اس سال 37.4 فیصد کم ہوئی ہے پاکستان بیورو شماریات کے مطابق فوڈ' پٹرولیم' کیمیکلز' انجینئرنگ پروڈکٹس' لکڑی سے بننے والے پروڈکٹس کھاد' چمڑا بھی ان دو ماہ میں پیداواریت کے تناظر میں کمی کا شکار رہا اگر فارماسیوٹیکلز کو دیکھیں تو کیپسول' انجکشن' گولیاں وغیرہ بالترتیب 79.2' 116.6 اور 57.7 کم ریکارڈ کی گئی' گھی اور سبزیوں میں 32 فیصد کمی آئی اور سیاست دان اور بیوروکریٹ کہتے ہیں کہ ہمیں کرپٹ کیوں کہا جا رہا ہے پھر وہ خود ہی بتائیں کہ پاکستان کہاں کھڑا ہے؟ ☆☆

بقیہ صالحہ اطہر

سازی بھٹہ کے کام وغیرہ شامل ہیں ان شعبوں میں کام کرنے والی عورتیں بد ترین استحصال کا شکار ہیں اجرتیں کم ہیں کام کے اوقات کار مخصوص نہیں پھر ان کے لیے کوئی قانونی تحفظ نہیں اسی طرح دیہات کی عورت بھی زمینوں پر بارہ سے سولہ گھنٹے کام کرتی ہے جب گھر کے معاشی حالات کا تقاضہ ہو کہ عورت بھی گھر کی آمدنی میں شامل ہو تو وہ ملازمت بھی کرے لیکن گھر کے کام جو اس کو تفویض کیے گئے ہیں وہ عورت ہی کو کرنا ہیں۔ اس میں کوتاہی ہو جائے تو تشدد بھی کیا جاتا ہے الزامات کی لمبی فہرست پر جھگڑا' زیادتی بھی سہتی ہے یہاں بھی ڈبل زیادتی اور تشدد کا شکار ہوتی ہے ملازمت کی جگہ پر بھی کیونکہ مالک بھی عورت کو اپنی طاقت سے کمزور سمجھتا ہے عورت کو اپنا غلام سمجھتا ہے ان ہی حالات کے ساتھ حکومتیں مذہبی اجارہ داروں کے ساتھ مل کر ایسے قوانین مرتب کرتی ہے جس میں انصاف ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر عورتوں کے لیے کچھ قوانین مرتب کر دیے جاتے ہیں تو اس پر عمل نہیں کیا جاتا بحیثیت انسان اس کی تھوڑی بہت آزادی بھی چھین لی جاتی ہے آمر ضیا الحق کے عطا کردہ کالے قوانین ابھی تک رائج ہیں اس آمر کے جانے کے بعد جتنی بھی حکومتیں آئیں ان قوانین سے نجات نہیں دلا سکیں حتیٰ کہ ایک عورت کی حکومت نے بھی انہیں ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

عورت فرسودہ رسم ورواج' غیر مساویانہ سلوک' مرد کی بالادستی کی شکار ہے۔ خاص طور پر پدرسری معاشرہ جو عرصہ دراز سے قائم ہے جس کی وجہ سے عورت کی خود مختاری کے حقوق ناپید ہو گئے ان سارے حالات سے عورت کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔

ایک بہت بڑا مسئلہ ہم جیسے ترقی پسند اور مارکسٹ انقلابیوں کا ہے جو تبدیلی کی بات کرتے ہیں معاشرے کے طور طریقے' نظام کی تبدیلی پر یقین رکھتے ہیں انصاف اور مساوات کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اس جدوجہد میں تشدد کا نشانہ بنتے ہیں جیل کی صعوبتیں اٹھاتے ہیں بڑے نعرے بلند کرتے ہیں پارٹی کے منشور کو لوگوں تک پھیلانے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں عورتوں پر ہونے والی زیادتیوں پر اپنی آواز بلند کرتے ہیں معاشرے سے لڑنے پر تیار رہتے ہیں مگر مگورا اپنی گھر کی عورت کو اپنے سیاسی کام سے دور اور نابلد رکھتے ہیں اس کو اس سیاسی کام میں شامل نہیں کرتے یہاں وہ اپنے فرسودہ رسوم ورواج سے ڈرتے ہیں جس کی عورت شکار ہے ان رسم ورواج کو ختم کرنے کا نہیں سوچ سکتے ہیں ان کے ذہن میں کہیں نہیں ہوتا کہ اپنے گھر کی عورت کو بھی باہر نکالیں وہ جن رسم ورواج کا شکار ہے اس سے نجات دلائیں مجبوریاں دور کرنے کے سلسلے میں کوئی مثبت قدم اٹھائیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیشہ تبدیلی گھر سے آتی ہے یہی تبدیلی سماج کو بدل دے گی معاشرے کو بدل دے گی دنیا کو بدل دے گی۔ اس ماہ ہم عورتوں کا عالمی دن منا رہے ہیں تو کیوں نہ ارادہ کر لیں کہ عورتوں کے معاشرتی ماحول میں بھی تبدیلی لائیں گے۔ ☆☆

''عوامی جمہوریت'' کے پچاس سال

ڈاکٹر شاہ محمد مری (قسط2)

ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' اور اس کے ایک گاؤں سے لے کر مرکزی دفتر تک کے اہلکار، مجھ جیسے بے شمار لوگوں کو نجات کے لیے لڑنے والے کارواں میں بھرتی کرتے چلے گئے۔ یوں یہ رسالہ نصف صدی تک مقہوروں، ضعیفوں اور محکوموں کا لائق فائق ترجمان رہا۔

اس باہمت رسالے نے 1969 میں اپنی پیدائش سے لے کر پچھلی صدی کی ستر کی دہائی تک سید مطلبی فرید آبادی اور سی آر اسلم کے ہاتھوں بلا مبالغہ ہزاروں بے چین ارواح کو راستے کی چوکھٹ مہیا کردی۔ سید صاحب کی موت کے بعد اگلے پچیس برس تک سی آر اسلم اِس چراغ کو ایوبی، یحییٰ ای، بھٹوئی، ضیائی اور بے نظیری شریفی آندھیوں طوفانوں میں بجھنے سے بچاتا رہا۔ ہما وشما بھیس بدل بدل کر حملہ کرنے والی اُن آندھیوں کی شدت اور تیز رفتاری کا اندازہ تک نہیں کرسکتا۔ اور اس چراغ کو بجھنے سے بچانے میں اُس بڑے آدمی نے اپنا کیا کچھ تج دیا تھا، وہ ایک الگ باب کا تقاضا کرتی ہے۔

10 جولائی 2007 کو سی آر اسلم انتقال کر گیا۔ اُس کے بعد کے اِن دس سالوں میں محترم اختر حسین سمیت کئی دوسرے دوستوں نے اُسے سنبھالا۔ اور اب یہ پچاس برس کا نیم سفید ریش راہبر ہے۔

واضح رہے کہ ایک طبقاتی فکر کے رسالے کے ساتھ اُس کا ایک پورا فکری کارواں جڑا رہتا ہے۔ اور رسالہ اُس کارواں کا ترجمان ہوتا ہے، اور اُس میں کام کرنے والے لوگ اُس کارواں کے رپورٹیئر ہوتے ہیں۔ چونکہ ''عوامی جمہوریت'' نچلے طبقات اور کچلی ہوئی قومیتوں کا ترجمان رسالہ رہا، اس لیے یہ رسالہ اُسی رواں کارواں کا ترجمان رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں رسالہ عوامی جمہوریت کی پیدائش اسی کارواں میں ہوئی تھی۔ تو سوال اُٹھتا ہے کہ عوامی جمہوریت سے حاملہ کارواں کے ترجمان کا اُس کی پیدائش سے قبل کیا نام تھا؟۔

بھئی، عوامی جمہوریت کمال کا شجرہ نسب رکھتا ہے۔ اس کے باکمال آباؤ اجداد کا تذکرہ کیے بغیر تسلسل کا معاملہ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ہم بہت زیادہ دور تو نہیں جائیں گے۔ بس عوامی جمہوریت کی دو پشتوں کا تذکرہ کریں گے۔

میرے پاس عوامی جمہوریت کے دادا، یعنی ''آفاق'' محنت ایڈیشن کی ایک بہت ہی بوسیدہ فائل موجود ہے۔۔۔ عوامی جمہوریت کے اِس گرینڈ فادر کے زمانے میں کارواں کے لوگ نیشنل عوامی پارٹی میں کام کرتے تھے اس لیے اُن کی ادارت میں چلنے والا یہ اخبار اُسی پارٹی کا ترجمان تھا اور لاہور سے شائع ہوتا تھا۔

یہ نیشنل عوامی پارٹی ایک ملٹی کلاس پارٹی تھی۔ یعنی اس میں صنعتکار طبقہ کی نمائندگی بھی تھی، جاگیردار طبقات بھی اسی میں دوام پائے ہوتے تھے، مڈل کلاس رجحانات بھی یہی سستا اور پناہ گزیں تھے۔ اور یہی پارٹی محنت کرنے والے لوگوں کی شعوری اور تنظیمی فاقہ زدگی کے زمانے کی بھی جائے پناہ تھی۔ ایک ملٹی کلاس پارٹی تھی۔ تقدیر نے مزدور طبقے کو بھی اُس ''شیر بکری ایک گھاٹ'' والی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ بہت ساری سادہ ارواح نے لواس عارضی پناہ گاہ ہی کو مستقل جانا اور چنانچہ یہ اُسی مکان کے بدلتے ناموں کی تہوں میں سے انقلاب کی تلاش میں پون صدی گزرا بیٹھے۔ مگر جن لوگوں نے ''اپنا'' الگ خیمہ کھڑا کرنے کے قابل بننے سے قبل تک اِس عبوری پناہ گاہ میں رہنا قبول کیا وہ اُس میں رہتے رہتے اپنے لیے تنکا تنکا کر کے الگ بستر اور برتن اکھٹے کرتے رہے۔ اس الگ بستر اور برتن کا نام انہوں نے ''آفاق'' محنت ایڈیشن رکھ دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں'' آفاق'' محنت ایڈیشن اُس ملٹی کلاس پارٹی کے اندر سوشلسٹ سیاست کی آواز تھا۔ بڑی سوچ کے لوگ تھے جنہوں نے مخاصم طبقات کو الگ الگ رکھ کر محض بڑی لڑائی کے مقصد میں ہی ایک رکھا۔

میری یہ فائل 5 جنوری 1966 سے شروع ہوتی ہے۔ معاشی سیاسی سماجی حالات کو سمجھاتے رہنے کی اور مزدور طبقے کو منظّم کرنے کوششوں میں مگن اخبار ''آفاق محنت ایڈیشن'' کی فائل میں میرے پاس آخری شمارہ 28 دسمبر 1966 کا ہے۔

اس کی سالانہ خریداری کے آٹھ روپے مقرر تھے، جبکہ ایک شمارے کی قیمت بیس پیسے تھی۔ اخبار کے سرورق پر اوپر ایک سرخ پٹی ہے جس کے دائیں طرف

پہیہ چھپا ہوا ہے اور بائیں طرف گندم کے خوشوں سے بنے دائرے کے بیچ ہل چلاتا ہوا ایک کسان چھپا ہوتا تھا۔ درمیان میں موٹا موٹا ''روزنامہ آفاق'' لاہور لکھا ہے۔ جس کے اوپر چھوٹی سرخی میں ''محنت ایڈیشن'' اور سرخی کے نیچے مینیجنگ ڈائریکٹر کے بطور راؤ مہروز اختر خان کا نام لکھا ہے۔ اس طرح اولین صفحے کے نیچے بھی ایک سرخ پٹی تھی جس پر ''محنت کشوں اور جمہوری قدروں کا ترجمان'' کی سرخی چھپی ہوتی تھی۔

واضح رہے کہ یہ آفاق، ایک ڈیلی اخبار تھا۔ مگر اُس روزنامے کے دوسرے شماروں سے اِن لوگوں کو کوئی غرض نہ تھا۔ انہوں نے بس بدھ کے دن کا اخبار لے رکھا تھا، اُس کا بھی عام حصہ نہیں بلکہ میگزین کا حصہ۔ اُسے انہوں نے ''محنت ایڈیشن'' کا نام دے رکھا تھا۔ اس طرح یہ ہفت روزہ بن گیا تھا پارٹی ورکرز کے لیے۔ ایک ایسے ڈیلی اخبار کا ''محنت ایڈیشن'' جو کہ ہر بدھ کو چھپتا تھا۔ اور یہ محنت کشوں کی پارٹی کے افکار کے لیے وقف تھا۔ اس بدھ والے ہفت روزہ میں کسان کمیٹی کی خبریں ہوتی تھیں، ٹریڈ یونین کی باتیں چھپتی تھیں اور اپنی ''پارٹی'' کی خبریں۔

اُس کے صفحوں کا سائز بعد میں 40 برس تک چھپنے والے عوامی جمہوریت جتنا ہوتا تھا مگر اُس کے صفحوں کی تعداد مختلف ہوتی تھی۔ یہ صفحات شروع میں بارہ اور بعد میں آٹھ ہوتے تھے۔ جبکہ عوامی جمہوریت کے شروع سے لے کر آخری عمر تک آٹھ ہی صفحے ہوا کرتے تھے۔ خط و کتابت اور خریداری کے پیسے بھیجنے کا پتہ تھا: سید مطلبی فرید آبادی۔ 5۔ مہر بانو سکیم۔ فرید کوٹ روڈ لاہور

محنت کشوں کے فلسفے کے اس ترجمان اخبار میں ہمیں مختلف جگہوں پر میٹنگوں کی خبریں ملتی ہیں۔ نیپ کے لیڈروں کی نہیں بلکہ نیپ کے اندر مزدور پارٹی کے راہنماؤں کی۔ جن میں سید فرید آبادی، سی آر اسلم، میجر محمد اسحاق، سید قسور گردیزی اور مرزا ابراہیم کے نام اکثر ملتے ہیں۔ نیشنل عوامی پارٹی میں مولانا عبدالحمید خان بھاشانی جیسے نام اکثر نظر آتے ہیں۔

اس رسالے میں بنی نوعِ انسان کے سو سالہ طویل دشمن، امریکی سامراجی کے خلاف کھل کر اور مدلل مضامین اور خبریں ہوتی تھیں۔ معاشی، سماجی اور سیاسی ہر طرح سے اس سامراجی ملک کے خلاف تجزیات چھپتے تھے۔ ایسی زبان میں جسے عام آدمی سمجھ سکے۔ بہت بڑی نعرے بازیوں سے بچتے ہوئے ایجوکیٹو سٹائل کو اپناتے ہوئے۔ مطلب شعور کی بنیاد پہ عوام کی تنظیم کاری تھی لہذا بڑے بڑے بول اور نعرے بازی سے ہمیشہ گریز کیا جاتا تھا۔ اس ہفت روزہ میں اسی وضاحت کے ساتھ اور سادہ زبان میں ویت نام، کیوبا، چین اور سویٹ یونین جیسے سوشلسٹ ممالک اور دیگر ممالک کی انقلابی تحریکوں کے بارے میں مضامین، خبریں اور مقالے ہوتے تھے۔

ہفت روزہ آفاق میں سی آر اسلم کے مضامین آپ کو اکثر نظر آتے ہیں۔ سنجیدہ، متین، سنگین، عام فہم، اور قائل کرنے والے انداز کے مضامین۔ ایک شمارے میں سی آر اسلم کی طرف سے تیار کردہ کیوبا کے فیڈل کاسٹرو کی اُس تقریر کے اقتباسات شائع ہوئے جو اس نے اپنے انقلاب کی چھٹی سالگرہ پر کی تھی۔ اُس پورے بڑے صفحے میں اُس کی تقریر سے کوٹیشن جیسے ٹکڑے منتخب کر کے دیے گئے ہیں۔ اسی طرح تقریباً ہر شمارے میں اِس دانشور کے مضامین موجود ہوتے تھے۔ عالمی تضادات کیا ہیں۔ ملک کے اندر طبقات اور ان کے مابین چپقلش کی نوعیت کیا ہے۔ ان تضادات اور چپقلشوں کا حل کیا ہے، بیرونی تجارت اور پاکستان کی معاشی ترقی کا باہمی تعلق کیا ہے؟، ریاست اور جمہوریت کا گورکھ دھندا کیسا ہے؟۔ ایسے ہی عنوانات کے تحت مضامین سی آر اسلم کے نام سے چھپے ہوئے ملیں گے۔ لیکن اندر غور سے دیکھیے تو بغیر نام کے بھی بے شمار مضامین آپ کو ملیں گے جن میں سے 70 فیصد سے زائد مضامین کا ڈکشن یہی سی آر اسلم والا ہے نظریاتی، سیاسی اور معاشی موضوعات پر۔

اسی طرح بین الاقوامی سوشلسٹ راہنماؤں کی تقریروں اور مضامین کے ترجمے ہیں۔ ایک اور باوقار کمیونسٹ ملک اسلم کا نام بھی کافی بار مترجم کے بطور چھپا ہوا ملتا ہے۔

اُسی زمانے میں سوویت یونین نے پاکستان اور بھارت کے بیچ دشمنی ختم کروانے کی ایک زبردست کوشش کی تھی۔ یہ دونوں ممالک تباہ کن جنگ لڑ چکے تھے۔ مالی وسائل اور انسانی جانوں کا بے تحاشا ضیاع ہو رہا تھا۔ جنگی ماحول میں دفاعی اخراجات اتنے بڑھ چکے تھے کہ عوام کی بہبود پر خرچ کرنے کے لیے پیسے نہ بچتے۔ ذرا سا کامن سنس پیدا ہوا تو سوویت یونین بیچ میں پڑا۔ زبردست مصالحتی سفارت کاری کے نتیجے میں اُس کے شہر تاشقند میں پاکستان ہندوستان کے بیچ مذاکرات ہوئے۔ جس کے ذریعے دونوں ملکوں کے درمیان تاشقند معاہدہ ہو گیا تھا۔

مگر جنگ باز تو امن کے آکسیجن کے ایک مالیکیول سے ہی بے آرام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک واویلا شروع ہو گیا۔ وہی ''غدار ہو گیا، وطن بیچ دیا'' جیسی سستی حب الوطنی کی کائیں کائیں ہونے لگی۔ اخباری کالموں، پوسٹروں، جمعہ کی

تقریروں اور جلسوں کے لاؤڈ سپیکروں نے اس معاہدے کے خلاف کان پھاڑنے شروع کر دیے تھے۔ رجعتی پریس بالخصوص چیخ اور چلا رہا تھا۔ یوں پورا ماحول جنگ آلود ہو چلا۔

یہاں ہمارے دوست ڈٹ گئے۔ آفاق محنت ایڈیشن میں ہمیں ''اعلانِ تاشقند'' کے حق میں زبردست مضامین اور قرار دادیں ملتی ہیں۔ اِس اعلان کے مخالفین کے خوب لتے لیے گئے ہیں۔ اور ایک نظریاتی فریضہ کے بطور امن کی مہم چلائی گئی۔ پاکستان کا نرم چہرہ دکھانے کا کسی کو احساس ہو تو اُس زمانے کے آفاق اخبار کے وہ مضامین الگ کتاب کی صورت میں چھاپنے کی قابل ہیں۔

اس رسالے کے صفحات میں ایک اور انوکھی جنگ بھی نظر آتی ہے۔ خیر ہمارے زمانے میں تو اب یہ جنگ اُس قدر ضروری نہیں رہی۔ تھا یوں، کہ اُس زمانے میں مزدور تحریک کی اپنی الگ طبقاتی سیاسی پارٹی موجود نہ تھی۔ بلکہ ملک کے اندر ایک بہت بڑی پارٹی موجود تھی جس کا نام ''نیشنل عوامی پارٹی'' تھا۔ اس پارٹی میں وہ سارے لوگ اور طبقات موجود تھے جو خارجہ امور میں امریکہ کی بالادستی کے خلاف تھے، جو ملک میں ون یونٹ کا خاتمہ چاہتے تھے اور جو ووٹ، الیکشن اور پارلیمنٹری نظام چاہتے تھے۔ چنانچہ اس پارٹی میں جاگیردار بھی موجود تھے، سرمایہ دار بھی، سردار بھی موجود تھے اور خان و نواب بھی۔ چونکہ مزدور تحریک کے لوگ بھی انہی نکات پر متفق تھے اور اُن کی الگ پارٹی موجود نہ تھی تو وہ بھی اسی کثیر طبقاتی چھتری کے نیچے کام کرتے تھے۔ لیکن چونکہ محنت کش لوگوں کی لوٹ کھسوٹ یہی جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ ہی کرتا تھا اس لیے اُس خلاف بھی بولنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک ہی پارٹی میں رہتے ہوئے اپنا اخبار الگ کر دیا تھا: آفاق۔

یہاں وہ نیشنل عوامی پارٹی کی متفقہ باتوں پر تو ساتھ دیتے تھے مگر اسی پارٹی کے رجعتی حصے پر ناترس تنقید بھی کرتے تھے۔ عزتِ نفس کا خیال رکھتے ہوئے مخالف طبقات کے نظریاتی اور سیاسی نقطۂ نظر پہ جان لیوا حملے موجود ہیں۔ یوں یہ اخبار بار بار اپنے ورکرز کو بتاتا رہتا ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی میں موجود کمیونسٹ گروہ الگ ہے اور سرمایہ دار گروہ الگ۔ اس واضح موقف کا بار بار دوہرایا جانا ہمیں باور کراتا ہے کہ فکر کی دنیا میں غفلت ناقابلِ معافی جرم ہوتا ہے۔

اخبار اپنے یا دوسرے دھڑے کے افراد کا نام بہت کم لیتا ہے۔ اسی لیے اخبار میں مخالفین کی ذات پہ بہت کم بات کی گئی۔ البتہ کبھی کبھی اپنی شناخت کے لیے نیشنل عوامی پارٹی پنجاب و بہاولپور کی خبریں اور اشتہار نظر آتے ہیں۔ ایک آدھ جگہ میاں محمود احمد کا نام اس گروہ والی پارٹی کے فنانشل سیکریٹری کے بطور چھپا ہوا ہے۔ وگرنہ بس سیاسی اور فکری فرق پہ سارا زور ہے۔

انٹرنیشنل کمیونسٹ تحریک کا یہ ترجمان اخبار عالمی سرمایہ داری نظام کی زبردست مخالفت کرتا ہے۔ اس لیے کہ صنعتی اور ٹیکنالوجیکل ترقی اور اس کی جگمگ کے باوجود انسانوں کی بڑی اکثریت کے حالات ابتر ہوتے جاتے ہیں۔ منافع اور قدرِ زائد جمع کرنے کی دوڑ والے اس نظام میں ہر ''چیز'' کماڈٹی ہوتی ہے۔ کماڈٹی میں متواتر چمک اور دمک ڈال دی جاتی ہے، اُسے پرکشش بنایا جاتا ہے۔ اور ہر حیلے بہانے سے ''انسان'' کی جیب خالی کی جاتی ہے۔ منافع اور انسان دو مخالف حقیقتیں ہیں۔ کماڈٹی کے پوش اور ڈبے اور پیکٹ جاذبِ نظر، خوبصورت اور مہنگی ہوتی جاتی ہیں اور انسان کا مکان، سڑک اور لباس بوسیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ اَن پڑھی، غربت، مہنگائی اور بے روزگاری کی واحد وجہ وہ نظام ہے جس میں منافع آزاد اور انسانیت زنجیروں میں ہے۔ ''آفاق ایڈیشن'' سمجھو اسی حقیقت کو آشکار کرنے کے لیے جاری کیا گیا تھا۔

لینن کے یومِ پیدائش سے قبل رسالے کا ایک خصوصی ایڈیشن نکالنے کا اعلان کیا گیا تھا: لینن ایڈیشن اور یہ ایڈیشن مقررہ تاریخ کو چھپا۔ صفحات تو زیادہ نہ تھے، وہی بارہ رہے مگر مضامین شاعری اور دیگر تحریریں لینن ہی سے متعلق تھیں۔ عنوانات تھے: لینن کے یومِ ولادت پر، انسانیت کا عظیم محسن۔ لینن کی تعلیمات، خراجِ عقیدت۔

اسی طرح یکم مئی کو ''مئی نمبر'' کے نام سے مزدوروں کے لیے خصوصی نمبر نکلا۔ مگر یہاں 12 کے بجائے 16 صفحات تھے۔ بات وہیں امریکی سامراج اور اُس کے عزائم سے شروع ہوتی تھی اور دیگر ممالک کے عوام کی کامیاب انقلابات کی حاصلات سے ہو کر پاکستان میں کسانوں اور مزدوروں کی تنظیموں کی سرگرمیوں اور قراردادوں تک آتی تھی۔

25 مئی 1966 کے شمارے میں پورے دو صفحات پر مشتمل تعزیتی میٹنگوں کی خبریں ہیں۔ عنوان ہے:

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

اور یہ تعزیتیں جہلم کے میرے آئیڈیل سیاسی ورکر لال خان نامی کمال آدمی کے لیے تھیں جو غریب طبقے کا بہت ہی کمیٹڈ، بہت سرگرم اور بہادر ساتھی تھا۔ اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہر اچھے انسان کا سمجھو فریضہ

ہے۔اس لیے کہ گورکی کی ایک کہانی کے مرکزی کردار ''کامو'' کا پاکستانی ایڈیشن دیکھنا ہوتو جان جایئے کہ اُس کا نام لال خان تھا۔ وہ ریلوے مزدور تھا اور پسے ہوئے طبقے کا بہت بڑا طرفدار۔

چونکہ 17 جون کو اس کے گاؤں میں اُس کی چالیسویں کا اجتماع رکھا گیا تھا اس لیے اخبار میں اشتہار چھپا ہے کہ 15 جون کا اخبار اسی کے متعلق (اور فیروز الدین منصور اور میاں افتخار الدین) مضامین چھاپے گا۔اور وہ اخبار چھپا بھی۔ یہ الگ اور ارمان بھری بات ہے کہ میرے پاس موجود فائل میں اُس کے اولین دو صفحے گم ہیں۔

اُسی زمانے میں ایوب نے بھٹو کو وزیر خارجہ کی ''نوکری'' سے نکال دیا۔اخبار آفاق نے اِس پہ ایک بہت ہی متوازن ردِعمل دکھایا۔اُس نے بھٹو کے عزائم پر خوب شکوک کا اظہار کیا۔ اِس واقعتاً ''شوبوائے'' نے غریبوں کی تحریک کو اتنا دیمک لگایا، اتنا کھوکھلا کیا کہ تحریک دوبارہ پاؤں پہ کھڑا نہ ہوسکی۔ اخبار کے ایڈیٹروں نے اپنے قارئین کے لیے بھٹو کے عزائم تفصیل سے بیان کیے۔مگر اُس کو وزیرِ خارجہ کے عہدے سے برطرف کرنے کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا۔ وہ یہ کہ ملک کی خارجہ پالیسی یکسر بدل دی گئی۔ ایوب نے خود ایسا نہ کیا' اُسے تو امریکہ کا ''حکم'' مل گیا تھا۔صرف افراد کو بدل دینا مقصد نہ تھا بلکہ پاکستانی خارجہ پالیسی کا رخ ازسرِ نو متعین کرنا مقصد تھا۔اس کے خلاف چار سطروں میں نہیں بلکہ 29 جون میں آفاق کا پورا صفحہ اس پر وقف کر دیا گیا۔ بات عوام تک لے جانی ہوتو بات تفصیل سے ہی کی جاتی ہے!۔

حیرانگی ہوتی ہے کہ وہ لوگ شعوری طور پر بین الاقوامی امور پہ زیادہ لکھتے تھے۔اپنے قارئین کو تحریکوں اور انقلابات سے متعلق ایجوکیٹ کرتے تھے۔ وہ ایسا مشن کے بطور کرتے تھے۔ چنانچہ اخبار میں جگہ جگہ سوویت یونین، چین، ویتنام اور کیوبا کے اخبارات سے حوالے، تراجم اور خبروں کو اردو میں ڈھال کر اپنے قارئین کو پہنچانے کا شاندار شعور موجود تھا۔تقریباً اس کے ہر شمارے میں یہ صورتحال موجود ہے۔ بالخصوص ویت نام کی جاری جنگِ آزادی تو تراتر کے ساتھ اخبار میں چھپتی تھی۔ بلاشبہ کسی جمہوریت پسند اور انقلابی پارٹی اور گروہ کے لیے بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک سے بے خبری موت ہوتی ہے۔

مگر آپ اُس وقت بہت حیران ہوں گے جب آپ یہ دیکھیں گے کہ باون برس قبل ہمارے دانشور جو کچھ کہہ رہے تھے ابھی بھی ہم وہی کچھ کہہ رہے ہیں۔لگتا ہے ہمارا سماج ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا۔ اتنا طویل جمود، اتنا لمبا سکوت !!۔

گو کہ یہ جدلیاتی قانون ہی ہے کہ کبھی کبھی تضادات میں توازن پیدا ہوجاتا ہے اور کچھ عرصے کے لیے تضادات میں سکون کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔مگر اس قدر طویل سکوت اور اس قدر گہری سکوت !!۔ ہمارا سماج کبھی کبھی تو جدلیاتی اصولوں کی صحت تک پر شک کرنے کی شیطانی ترغیب دیتا نظر آتا ہے۔ ہمارا خطہ اگر روشن فکر نظریات کا قبرستان نہیں تو ان کی جائے افزائش بھی نہیں۔

مثلاً 21 ستمبر 1966 کے آفاق میں اُس مضمون کا آخری پیراگراف دیکھیے جو نواب کالاباغ، (امیر محمد خان) کی جگہ جنرل موسیٰ کو مغربی پاکستان کا گورنر لگائے جانے پر لکھا گیا تھا: ''اس غلطی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، کہ محض افراد کی الٹ پلٹ سے عوام کی زندگی کے مسائل حل ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ عوام کی زندگی کے مسائل کا دار و مدار اب تک عوام کی مضبوط تنظیم، سیاسی شعور کی پختگی اور جدوجہد کے تسلسل پر رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا''۔

اِس بات کو نصف صدی گزر گئی مگر آج بھی یہاں جاگیرداروں ہی کے درمیان الیکشن ہوتے ہیں۔عوام اُن جاگیرداروں میں سے ایک کو ووٹ دینے پر مجبور رہیں۔اور پھر جو بھی جاگیردار جیت جائے تو لاکھوں عوام مسرت کے ابلیسی رقص میں اپنے پاؤں شل کرتے ہیں۔آج بھی بغیر منشوروں کے الیکشن ہوتے ہیں۔آج بھی غیبی وقوعات اچانک نظر آتے ہیں۔کوئی قانون نہیں، فزکس کے اصول لگتا ہے لاگو ہی نہیں ہیں، اور حرکت و برکت کے جدلیاتی فارمولے غیر معینہ مدت تک کے لیے رہن رکھے جاچکے ہیں۔کبھی کبھی دیکھیے تو لگتا ہے ہمارے ارتقا کا سفر تو دائروں تک کا سفر بھی نہ رہا۔ بلکہ یہ تو پچھل پیری کا سفر ہے ۔اُس زمانے میں مولانا مودودی اور میاں طفیل تھے تو آج مولوی رضوی، پیر سیالوی اور طاہر القادری ہیں۔خود فیصلہ کیجئے کہ اس ربع صدی میں فکری ارتقا کی سمت کیا رہی، آگے یا پیچھے؟۔

''آفاق محنت ایڈیشن'' والوں کے لیے اُس وقت بھی حالات موزوں نہ تھے، آج بھی نہ بدلے۔ اُس وقت جو عوام مخالف کام سرکار او اس کا اخبار ''نوائے وقت'' کرتے تھے آج ڈیڑھ سو ٹی وی چینل کرتے ہیں، سوشل میڈیا کرتا ہے۔کل مارشل لا جو کام آمریت اور اندھی قوت سے کرواتا تھا، آج وہی کام اندھی قوت کے ساتھ ساتھ پارلیمنٹ کرتا ہے۔عوام کے ذہنوں پہ ایک طرف ''شیر آیا'' کی یلغار ہے تو دوسری طرف تیر اور بلاّ اُس کا شعور کند کررہے ہیں۔سچائی کی جیت تو حتمی ہے مگر لگتا ہے اُس کے آج کے آفاق محنت ایڈیشن کو تعداد میں زیادہ اور تنظیم میں مزید منظّم قارئین چاہییں۔(جاری ہے)

18ویں ترمیم اور انتخابات

ڈاکٹر توصیف احمد خان

فوج کے تعلقات عامہ کے شعبہ کے سربراہ نے اس بات کی تردید کی ہے کہ باجوا ڈاکٹرائن کا مطلب انتخابات نہ کرانا یا اٹھارہویں ترمیم کا خاتمہ ہے۔ باجوا ڈاکٹرائن صرف ملک کے دفاع سے متعلق ہے مگر گذشتہ کئی برسوں کے واقعات کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عسکری اسٹیبلشمنٹ ریاست پر اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتی ہے اور اس بالادستی قائم کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ملک کا آئین ہے۔ جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں تبدیل ہوا، 80 ہزار قیدی بھارت کی قید میں چلے گئے اور 10 ہزار مربع میل کے علاقے پر بھارت نے قبضہ کرلیا تو عسکری اسٹبلشمنٹ کی حیثیت کم ہوگئی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 1973ء کا آئین متفقہ طور پر تیار ہوا۔ آئین کے تحت صدر علامتی قرار پائے۔ تمام اختیارات پارلیمنٹ کو منتقل ہوگئے۔ آئین میں وفاق اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے لیے تین فہرستیں شامل ہوئیں۔ ایک فہرست وفاقی امور کی، دوسری صوبائی امور کی اور تیسری فہرست ان معاملات کی تھی جس پر وفاق اور صوبے دونوں قانون بنا سکتے تھے مگر وفاق کی قانون سازی کو صوبوں پر برتری حاصل ہوئی۔ پھر وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما غوث بخش بزنجو سے وعدہ کیا کہ مشترکہ فہرست 10 سال بعد ختم کردی جائے گی اور تمام اختیارات صوبوں کو حاصل ہوجائیں گے، یوں 1940ء کی قرارداد لاہور کے مطابق صوبوں کو خودمختاری حاصل ہوجائے گی مگر پھر امریکہ اور شہنشاہ ایران کے دباؤ پر وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کی بلوچستان کی مخلوط حکومت کو توڑا اور لسبیلہ ڈویژن میں فوج بھیج دی۔ جمعیت علماء اسلام کے سربراہ مفتی محمود کی قیادت میں سرحد کی حکومت مستعفی ہوگئے۔ وفاقی حکومت نے سرحد کے گورنر ارباب سکندر خلیل اور بلوچستان کے گورنر میر غوث بخش بزنجو کو برطرف کردیا۔ پھر خفیہ عسکری ایجنسی کی ایماء پر عراقی سفارت خانے سے اسلحہ برآمد ہوا۔ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کی تقریب میں ہونے والے دھماکے میں پیپلز پارٹی کے رہنما حیات محمد خان شیر پاؤ جاں بحق ہوگئے۔ بھٹو حکومت نے نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگادی۔ نیپ کے تمام رہنماؤں، پیپلز پارٹی کے منحرف رہنماؤں معراج محمد خان اور علی بخش تالپور سمیت بہت سے کارکنوں کو حیدرآباد سازش کیس میں ملوث کیا گیا۔ بھٹو حکومت نے دو ڈویژن فوج کا اضافہ کیا۔ بحری اور فضائی فوج کو جدید ہتھیاروں سے لیس کیا گیا۔ بھٹو صاحب نے ایٹم بم کا ہتھیار فوج کو دینے کے لیے منصوبہ شروع کیا۔ یوں بھٹو حکومت کا انحصار عسکری اسٹیبلشمنٹ پر بڑھ گیا۔ عسکری اسٹیبلشمنٹ کی ایماء پر جماعت اسلامی اور جمعیت علماء پاکستان نے سندھ میں لسانی فسادات کرائے۔ بیوروکریسی نے بھٹو حکومت کی پالیسیوں پر کنٹرول کرنا شروع کیا۔ کراچی کے سائٹ اور لانڈھی کے صنعتی اداروں میں مزدور تحریک کو طاقت کے ذریعے کچل دیا گیا۔ بھٹو حکومت اپنی مظلوم طبقات کی حمایت میں نافذ کردہ اصلاحات کے باوجود کمزور ہوتی چلی گئی۔ پھر حکومت نے عام انتخابات کا اعلان کیا۔ فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق کے روڈ میپ کے مطابق پاکستان قومی اتحاد قائم ہوئے۔ انتخابات میں دھاندلیوں کے نام پر تحریک چلی۔ جب بھٹو حیدرآباد ٹریبونل کے خاتمے کے لیے تیار ہوئے تو فوج رکاوٹ بن گئی۔ جب بھٹو حکومت اور پی این اے کے رہنماؤں کے درمیان 5 جولائی 1977ء کی رات گئے معاہدہ ہوا تو جنرل ضیاء الحق نے بھٹو حکومت کو برطرف کردیا۔ پھر ایک متنازعہ عدالتی فیصلے کے تحت ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیدی گئی۔ پھر جنرل ضیاء الحق نے انتخابات ملتوی کیے اور اسلامی نظام کے نفاذ کا بیڑا اٹھایا گیا۔ پھر 1983ء میں چلنے والی ایم آر ڈی کی تحریک کے دباؤ اور بین الاقوامی حالات میں تبدیلیوں کی بناء پر 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات منعقد کرائے۔ آئین میں آٹھویں ترمیم پر جونیجو حکومت کے اتفاق رائے کے بعد مارشل لاء کے خاتمے کے لیے تیار ہوئے۔ پھر 1988ء میں آٹھویں ترمیم کے تحت ملنے والے اختیارات کی بناء پر اپنے نامزد کردہ وزیر

اعظم جونیجو کی حکومت کو برطرف کر دیا۔ پھر جنرل ضیاء الحق کے جانشین غلام اسحاق خان نے آٹھویں ترمیم کے ذریعے پہلے بے نظیر بھٹو اور پھر میاں نواز شریف حکومت کو برطرف کیا۔ پھر پیپلز پارٹی کے پرانے کارکن فاروق لغاری نے اس ترمیم کے ذریعے اپنی جماعت کی سربراہ بے نظیر بھٹو حکومت کو برطرف کیا۔ جب میاں نواز شریف دوسری دفعہ اقتدار میں آئے تو انہوں نے قائد حزب اختلاف بے نظیر بھٹو سے صدر کے اسمبلی کے خاتمے کے آئینی اختیار کے خاتمے کے لیے مدد طلب کی۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نے پارلیمنٹ سے متفقہ طور پر صدر کا قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں توڑنے کا اختیار ختم کر دیا۔ میاں نواز شریف نے اپنے دوسرے دور حکومت میں بھارت کے وزیر اعظم واجپائی کو لاہور مدعو کیا۔ واجپائی نے یادگار پاکستان پر حاضری دی اور پاکستان کی سالمیت کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ پھر دہلی سے لاہور تک دوستی بس شروع ہوئی۔ فوج کے سربراہ جنرل جہانگیر کرامت نے پارلیمنٹ سے بالا نیشنل سیکیورٹی کونسل کے قیام کی تجویز پیش کی۔ وزیر اعظم نواز شریف نے فوج کے سربراہ کے بیان کو مسترد کیا اور جنرل جہانگیر کرامت کو مستعفی ہونا پڑا۔ میاں نواز شریف حکومت نے لیفٹیننٹ جنرل پرویز مشرف کو فوج کا سربراہ مقرر کیا۔ جنرل مشرف نے پاکستان کے دورے پر آنے والے بھارتی وزیر اعظم واجپائی کو سلامی نہیں دی۔ پھر کارگل پر چڑھائی کی۔ وزیر اعظم نواز شریف نے امریکی صدر کلنٹن کی مدد سے کارگل کا معاملہ طے کرایا۔ پاکستان کی پوری دنیا میں بدنامی ہوئی۔ پھر 10 اکتوبر 1999ء میں جنرل مشرف نے نواز شریف حکومت کو برطرف کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ جنرل مشرف نے 2002ء میں عام انتخابات منعقد کرائے۔ آئین میں ایک نئی ترمیم 58(2)B شامل کی جس کے تحت صدر کو قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں توڑنے کا اختیار حاصل ہوا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف نے 2005ء میں لندن میں میثاق جمہوریت پر دستخط کیے۔ 2010ء میں آئین میں کی گئی 18ویں ترمیم کے ذریعے صدر کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑنے کے اختیارات ختم ہوئے اور وفاق کے بیشتر اختیارات صوبوں کو منتقل ہو گئے۔ اگرچہ اس ترمیم کے ذریعے صوبوں کو اپنے قدرتی وسائل کو مکمل طور پر استعمال کرنے کا حق حاصل نہیں ہوا مگر ملک کی تاریخ میں پہلی دفعہ اتنے زیادہ اختیارات صوبوں کو منتقل ہوئے اور نئے فارمولے کے تحت قومی مالیاتی ایوارڈ (N.F.C) کی تشکیل نو ہوئی۔ میاں نواز شریف حکومت نے بھارت، افغانستان اور ایران کے ساتھ تعلقات کے نئے دور کا آغاز کیا۔ پھر قومی مالیاتی ایوارڈ کی بناء پر مسلح افواج کو بجٹ سے زیادہ رقم دینے سے انکار کیا۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے عمران خان کے دھرنوں کے ذریعے نواز شریف حکومت کو کمزور کیا گیا اور پھر اسٹیبلشمنٹ کو پاناما لیک کا ہتھیار مل گیا۔ سپریم کورٹ نے ایک متنازعہ فیصلے کے ذریعے میاں نواز شریف کو نااہل قرار دیا اور مسلم لیگ کی صدارت سے ہٹا دیا گیا مگر وسطی اور جنوبی پنجاب میں میاں صاحب کی مقبولیت بڑھ گئی۔ اب نواز شریف دعویٰ کر رہے ہیں کہ احتساب عدالت میں ان کے خلاف چلایا جانا والا مقدمہ کمزور ہے اور استغاثہ کے اہم ترین گواہ واجد ضیاء کوئی ٹھوس ثبوت نہیں پیش کر پائے ہیں، جنرل پرویز مشرف کا کسی عدالت میں پیش ہوئے بغیر ضمانت پر رہائی، فیض آباد دھرنے کے خاتمے میں فوجی افسروں کے کردار، بلوچستان میں راتوں رات اراکین صوبائی اسمبلی کے اپنے مؤقف میں تبدیلی، سینٹ میں آزاد رکن کا چیئرپرسن منتخب ہونے اور سندھ میں ایم کیو ایم کے رہنماؤں اور کارکنوں کی پی ایس پی میں شمولیت جیسے معاملات سے عسکری اسٹیبلشمنٹ کے اس بڑھتے ہوئے رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔ سپریم کورٹ لاپتہ افراد کے مسئلے پر از خود نوٹس لینے کو تیار نہیں۔ بلوچستان میں عسکری ایجنسیوں اور سماچاروں کی کارروائیوں سے عام آدمی کی زندگی اجیرن بن گئی ہے۔ پیپلز پارٹی اور تحریک انصاف اسٹیبلشمنٹ کے روڈ میپ پر دوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے قائد آصف علی زرداری کی ساری جستجو سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی دولت بچانے اور دنیا کے 100 بڑے افراد میں اپنا نام شامل کرانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ عمران خان زندگی میں ایک دفعہ وزیر اعظم بننے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف امریکی حکومت نئی پابندیاں لگانے والی ہے۔ ڈالر کی قیمت بڑھنے سے زرمبادلہ کا بحران پیدا ہو رہا ہے۔ اس ماحول میں انتخابات منعقد ہونگے۔ حقائق کے پیچھے محرکات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عسکری اسٹیبلشمنٹ مختلف جماعتوں کی انتخابات میں کامیابی کی خواہاں ہے تاکہ ایک کمزور وفاقی حکومت قائم ہو جس کا لیور راولپنڈی میں ہو۔ پھر 18ویں ترمیم کا کیا ہوگا؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔☆☆

بھگت سنگھ کا راستہ ہمارے لیے نشانِ راہ!

محمد سعید

اس لمحے زمین کے طول وعرض پر اربوں انسان اس عظیم ساعت کو بسر کررہے ہیں اس کے بعد ان کے لیے وقت فنا ہوجائے گا بہت ساری شہادتیں نشان چھوڑے بغیر مٹ جائیں گی اور یہ انسان' یہ شبہیں یہ آوازیں جلد ہی حافظوں سے محو ہوجائیں گی ان فنا ہونے والی شہادتوں میں کچھ ایسی ہیں جو زندہ رہیں گی جن کی یاد نسل درنسل منتقل ہوتی رہے گی۔ بھگت سنگھ فنا اور محو ہونے والے لمحات سے آزاد ہے وہ تاریخ کی ایک زندہ ہستی ہے۔

بھگت سنگھ کو ۲۳/ مارچ ۱۹۳۱ کو پھانسی دی گئی۔ اس کی نعش کو غائب کرنے کے لیے تاکہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے جلا کر دریائے ستلج میں فیروز پور کے قریب بہادی گئی بھگت سنگھ وقت کی قید سے آزاد تھا۔ وہ آج بھی ایک ہیرو کے طور پر زندہ ہے وہ اس وقت بھی ہندوستان کے جذبوں اور امید کا نشان تھا وہ آج بھی مشعل راہ ہے۔

موت کے وقت بھگت سنگھ چوبیس برس کا تھا جو حیرت انگیز ہردلعزیزی اسے ملی وہ اس کرہ ارض پر کم کم لوگوں کو نصیب ہوئی کچھ وقت کے لیے اس کی مقبولیت گاندھی کے مقابلے پر تھی نہرو لکھتا ہے کہ چند ماہ میں پنجاب کا ہر گاؤں ہر شہر اور ایک حد تک شمالی ہند اس کے نام سے گونج رہا تھا اس کی شان میں گیت گائے جانے لگے۔

ہمارا یہ ہیرو بھگت سنگھ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پچاس سال بعد ۲۷ ستمبر ۱۹۰۷ء کو پنجاب کے ضلع لائل پور ۱۰۵ گ ب بنگے چک میں ایک سیاسی اور سماجی شعور رکھنے والے گھر میں پیدا ہوا ان کا خاندان مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کے ایک گاؤں کھٹکا کلاں سے آبادکاری کے عوض ملنے والی زمین کی وجہ سے یہاں آباد ہوا تھا وہ ودیاوتی اور کشن سنگھ کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں پنجاب میں انجمن محبان وطن بنی جو خالص سیاسی خفیہ انقلابی تنظیم تھی یہی انجمن بھارت ماتا سوسائٹی کے نام سے مشہور ہوئی پنجاب میں اس کے کرتا دھرتا تین بھائی سردار کشن سنگھ اجیت سنگھ اور سورن سنگھ تھے۔ برطانوی سرکار پنجاب کے نہری علاقوں کی زمین کے بارے میں ایک نیا قانون نافذ کرنا چاہتی ہے اس کا کالونائزیشن بل میں آبادکاروں کو کھیتی باڑی کا حق تو دینا چاہتی تھی مگر حقوق ملکیت سے انہیں محروم رکھنا مقصود تھا اس قانون کے خلاف کسانوں کی تحریک میں اس کے والد نے حصہ تھا بھگت سنگھ کی پیدائش کے وقت یہ تینوں بھائی انگریز کی قید میں تھے۔

بھگت سنگھ نے ایک وطن سے محبت رکھنے والے خاندان میں پرورش پائی مگر بھگت سنگھ کے سماجی اور سیاسی خیالات کی تشکیل میں بہت سارے عناصر کا ہاتھ تھا وہ کرتار سنگھ سرابھا کی ہمت' حب الوطنی اور قربانی کے جذبے سے خاص طور پر متاثر تھا غدر پارٹی میں شامل ہوکر آزادی کی جدوجہد کرنے والے انیس سالہ نوجوان کرتار سنگھ سرابھا کو ۱۳/ مارچ ۱۹۱۵ء کو پھانسی دی گئی پنجاب کا ہر گاؤں اس کی بہادری اور جاں نثاری کی داستانوں سے گونج رہا تھا بھگت سنگھ نے سرابھا کو اپنا رول ماڈل بنایا اس کی تصویر وہ ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا تھا۔

برطانیہ پہلی جنگ عظیم میں بری طرح الجھا ہوا تھا ادھر ہندوستان کی ذلت و غلامی اور محنت کش طبقے کی غربت وزبوں حالی نے تمام محبّ وطن عناصر کو مضطرب کردیا تھا خصوصاً پنجاب میں نہروں کی وجہ سے آبادکاری سے ایک طبقہ پیدا ہوا جو ریاستی جبر کی وجہ سے اضطراب میں تھا وہ جوش میں تھا لڑنے مرنے کے جذبوں سے لبریز تھا پہلی جنگ عظیم میں بحری راستے بند ہوجانے' برطانوی حکومت کے ہندوستان میں بعض صنعتی مراکز کھولنے رسد وغیرہ کی فراہمی کے انتظامات ہندوستان میں پیدا کرنے اور بنیادی جنگی ضرورتوں کی فراہمی کے اڈے قائم کرنے نے اس کشمکش کو مزید ابھارا۔

اس اضطراب کو دیکھتے ہوئے برطانیہ نے دوران جنگ ہندوستان کو یقین دلایا کہ جنگ ختم ہوتے ہی نئی اصلاحات نافذ کی جائیں گی جس میں سیاسی

مراعات کی یاددہانی کروائی گئی تھی لیکن توقعات کے خلاف رولٹ ایکٹ نافذ کیا گیا جس کے تحت سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرکے اسے بغاوت قرار دیا گیا۔

اس قانون کے تحت سرکار کسی بھی شخص کو گرفتار کرکے بغیر مقدمہ چلائے جیل میں بند کرسکتی تھی ۶ راپریل ۱۹۱۹ء کو پورے ملک میں رولیٹ بل کے خلاف ہڑتال ہوئی ۱۳ اپریل کو جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک احتجاجی جلسہ ہورہا تھا جنرل ڈائر نے بغیر وارننگ دیے نہتے شہریوں پر فائرنگ کرنے کا حکم دیا۔ منٹوں میں جلیانوالہ باغ خون میں نہاچکا تھا اس واقعے میں ۳۷۹ بے گناہ افراد شہید اور بے شمار زخمی ہوئے اس وقت بھگت سنگھ ڈی اے اسکول لاہور میں زیر تعلیم تھا اس واقعے نے نوجوان بھگت سنگھ کے قلب وذہن پر دکھ اور ذلت کے انمٹ اثرات چھوڑے۔

۱۹۲۰ء میں کانگریس کا خاص اجلاس کلکتہ میں ہوا ترکِ موالات کا معاملہ طے کیا گیا آئندہ تین ماہ میں ترکِ موالات کا بڑھتا ہوا سیلاب پورے ملک میں پھیل گیا ترکِ موالات عوامی تحریک تھی انگریز نے اپنے آپ کو چھاؤنیوں تک محدود کرلیا تھا۔ وہ عوام کی بیداری سے خوفزدہ تھا۔ گاندھی نے سرکار اور حکومتی امداد سے چلنے والے اداروں سے قطع تعلق کی ہدایت کی تھی۔ بھگت سنگھ نے ڈی اے وی اسکول چھوڑ کر لالہ لاجپت رائے اور بھالی مانند کے قائم کردہ نیشنل اسکول میں داخلہ لے لیا یہیں بھگت سنگھ کی شناسائی بھگوتی چرن ووہرہ، سکھ دیو اور لشپال سے ہوئی ان تمام نوجوانوں سے تحریک عدم تعاون میں سرگرم کردار ادا کیا۔ گاندھی کے نعرے ایک سال میں سوراج نے ان میں قوم پرست جذبات بھر دیے تھے ان حالات میں مادر وطن کے شیدائی آزادی اور خود مختاری کی نئی جہتوں اور نئے راستوں کی جستجو کررہے تھے سماج کے دکھوں کو ختم کرنے کی تڑپ اور بے چینی جسکے بغیر کوئی جدوجہد کوئی کوشش ممکن نہیں بھگت سنگھ کے تن من میں سما چکی تھی بچپن کی معصومیت اور بے فکری کی دہلیز پار کرنے والا لڑکا اب علم اور انقلاب کی دشوار گزار راہوں کا مسافر تھا

گاندھی کی ترک موالات تحریک سے پسپائی اور ریاستی جبر سے وقتی مایوسی آئی نوجوان طبقہ قدرتی طور پر زیادہ مشتعل ہوا کیونکہ بڑھتی ہوئی امیدوں کا قلعہ یکا یک بیٹھ گیا کانگریس سمجھوتوں کی قائل تھی۔ وہ آزادی تو چاہتی تھی مگر کوئی سماجی تبدیلی نہیں۔ اس کی وجہ سے ہندوستان کی آزادی کے دوسرے امکانات پر غور ہونا شروع ہوگیا۔

۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب ہوچکا تھا اس انقلاب نے آزادی کے مفہوم کو ہی بدل دیا بالشویک انقلاب مزدوروں کسانوں کا انقلاب تھا۔ یہ انقلاب اپنے اثرات دنیا میں پھیلا رہا تھا بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے مارکسی لینن کی تحریروں کا مطالعہ کیا یہیں سے ان کے شعور میں گہرائی آئی اور چیزوں اور واقعات کو دیکھنے میں وسعت نظر پیدا ہوئی۔ بھگت سنگھ کی انقلابی سرگرمیوں کا دور اس وقت شروع ہوا تھا جب اس نے لاہور کو خیرباد کہہ کر کان پور کا رخ کیا اس دوران وہ سرعت سے دوسرے انقلابیوں کے ساتھ روابط قائم کرنے میں مصروف رہا۔ کان پور میں اس کا قیام گنیش شنکر ودیاتھی کے ہاں تھا اسے یا تو کیشو دت، سجوگی، چندر شیکھر آزاد سے ملاقاتوں اور تبادلہ خیال کا موقع ملا اس نے وہاں پر ہندوستان انقلابی ایسوسی ایشن میں شمولیت اختیار کی جو سچندرا ناتھ سنہال نے ۱۹۲۳ء کے اواخر میں قائم کی جس کے منشور میں کہا گیا تھا..... یہ کہنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے کہ ہندوستانی سیاسی آزادی کا حصول پرامن اور قانونی طریقوں سے ممکن ہے جب دشمن اپنی سہولت کے لیے امن تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے تو قانون جیسا خوبصورت لفظ اپنی تمام خوبصورتی کھو دیتا ہے۔ ابتدا میں بھگت سنگھ سماج میں تبدیلی لانے کے لیے انفرادی بہادری کا قائل تھا۔ اذیتوں کے اظہار کے لیے، سچے نصب العین کی سربلندی کے لیے طاقت کا جواز بھی تھا۔ اس کا یقین تھا کہ دہشت گردی بذات خود کوئی مقصد نہیں سرکاری دہشت گردی کا مقابلہ دہشت گردی سے ہی ممکن ہے۔ گاندھی کے عدم تشدد سے بھگت سنگھ کا یقین اٹھ چکا تھا وہ سوچتا تھا کہ ہمارے معاشرے میں کاہلی، بے بسی اور بے حسی سرایت کرچکی ہے۔ اس اثر کو زائل کرنے کے لیے دہشت گردی موثر ہوسکتی ہے۔

بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے لاہور میں مارچ ۱۹۲۶ء میں نوجوان بھارت سبھا قائم کی۔ بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں ہندوستان کی آزادی اور اس کے مستقبل پر غور ہورہا تھا ان کا اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ جب

تک مزدور، کسان طبقہ اقتدار پر قبضہ نہیں کرے گا تب تک موجودہ استحصالی نظام ختم نہیں ہوگا وطن کی آزادی کے ساتھ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کا خاتمہ اس سبھا کا منشور تھا۔

۱۹۲۷ء کے آخر میں ہندوستان میں نافذ قوانین میں ترمیم کرنے کے لیے ایک سائمن کمیشن مقرر کیا گیا جس کے تمام اراکین انگریز تھے جب سائمن کمیشن فروری ۱۹۲۸ء میں بمبئی پہنچا تو اس کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کیا گیا سارے ملک میں اس کے خلاف جلسے جلوس اور مظاہرے ہوئے لاہور میں نوجوان بھارت سبھا نے تمام محبّ وطن کے ساتھ مل کر جدوجہد کا فیصلہ کیا سائمن کمیشن ۳۰ راکتوبر ذریعہ ٹرین لاہور پہنچا تو اس کے خلاف بڑا احتجاجی مظاہرہ ہوا اس مظاہرے میں لالہ لاجپت رائے بھی شریک تھے پولیس نے لاٹھی چارج کیا ان کے سینے اور سر پر لاٹھیاں ماریں وہ زخمی ہوئے اور پھر صحت مند نہ ہو سکے ۱۷ رنومبر ۱۹۲۸ء کو انتقال کر گئے لالہ لاجپت رائے کے قتل نے ہندوستان کی بے بسی کے احساس کو بہت گہرا کر دیا سارے انقلابی نوجوان اس قومی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ سانڈرس کو قتل کر کے لالہ جی کی موت کا انتقام لے لیا گیا۔ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو امید تھی کہ اس کا عوام میں گہرا ردعمل ہوگا اور ملک میں ایک سامراج دشمن تحریک کا آغاز ہو جائے گا۔ کئی ماہ تک ملک میں جمود کی کیفیت طاری رہی سانڈرس کی موت ایک فرد کی موت تھی طاقتور برطانوی سامراج ایک فرد کی موت سے متاثر ہو کر ہندوستان چھوڑنے پر مجبور نہیں ہو سکتا تھا۔

اس سیاسی صورت حال کے پیش نظر ایچ ایس آر اے نے اپنے ایک اجلاس میں دلی مرکزی اسمبلی میں بم پھینکنے کا فیصلہ کیا اس حملے کا مقصد کسی کو مارنا ہرگز نہیں تھا بلکہ اہل وطن کو خواب غفلت سے بیدار کرنا تھا یہ چیلنج بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی یا تو کیشو دت نے قبول کیا بم پھینکنے کے بعد ان دونوں نے گرفتاری دے دی لیکن اپریل کے تپتے ہوئے دن بھی صدیوں سے بادشاہوں کے محکوم ہند کا مرکزی شہر تاج برطانیہ کی سنگینوں کے سائے میں غلامی کی نیند سوتا رہا۔

آزادی اور سماجی انصاف حاصل کرنے کا کوئی سادہ اور سہل راستہ نہیں ہے۔ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے عوامی بیداری، آزادی، انقلاب اور سماجی انصاف کے تصورات پورے ہندوستان میں پھیلانے کی کوشش کی انہوں نے عدم تشدد کے اس خیالی دور کے خاتمے پر مہر لگا دی جس کے بے اثر ہونے میں ابھرتی ہوئی نسل کو شبہ تھا نہرو بھگت سنگھ کی شہادت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے عدم تشدد کا طریقہ ہر موقع پر کام نہیں دے سکتا یعنی یہ کوئی عالم گیر اور حکمی طریقہ عمل نہیں ہے۔ بھگت نے جو سوچا اس کا جاندار طریقے سے اظہار بھی کیا۔ بھگت سنگھ کا فکری سفر جاری رہا۔ ۱۹۳۱ء کو پنجاب کیسری میں اس کا خط اپنے ساتھیوں کے نام شائع ہوا اس خط میں اس نے لکھا:

''میں اپنی پارٹی کے مقاصد اور ذرائع کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہوں گا اس کا نام ہے ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن (عوامی جمہوریت) اس کا مقصد ہے سوشلسٹ سماج کا قیام، کانگریس اور ہماری پارٹی میں اتنا فرق ہے کہ وہ انگریزوں سے اقتدار حاصل کرنے کے بعد مطمئن ہو جائے گی جبکہ ہمارا مقصد سماج واد کا قیام میں لانا ہے۔ پارٹی کو اب اس مقصد کے لیے خفیہ طور پر کام کرنے کی ضرورت نہیں.....

انقلاب سے میرا مقصد موجودہ نظام اور ڈھانچے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ اس کام کے لیے ہمیں حکومت کے اقتدار کو حاصل کرنا ہے جو اس وقت سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے عام لوگوں کی بھلائی اور اپنے آدرش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اقتدار کی مشین کو مارکس کے اصولوں پر پرکھنا ہے یہی ہماری جدوجہد کا مقصد ہے۔

عظیم شخصیات اپنے کردار اور خوبیوں کی وجہ سے معاشرے کو متاثر کرتے ہیں بعض اوقات یہ اثر بہت نمایاں ہوتا ہے ضروری نہیں کہ جن آدرش کے لیے وہ اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہوتے ہیں کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ عظیم شخصیت سماجی ترقی اور تبدیلی میں عامل کے طور پر اس وقت میں اس قدر اثر انداز ہو سکتی ہے جتنی معاشرتی تنظیم اس کی اجازت دیتی ہے۔ متحارب طبقات اور قوتوں کا توازن بھی محل نظر ہوتا ہے۔

شہید بھگت سنگھ ایک عظیم انسان تھے اور ایک ایسی توانائی سے مالا مال تھے جو اندھیروں میں روشنی، غلامی کو آزادی اور غربت کو خوشحالی میں تبدیل کر سکے، اس کا یقین تھا کہ اس دھرتی میں سماجی انصاف پر مبنی معاشرہ ضرور قائم ہوگا۔ بھگت سنگھ کی جدوجہد اب بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔☆☆

یہ بہت بڑی خبر ہے.....تو قیر چغتائی

یوم پاکستان کی تقریب ہمیشہ کی طرح بھرپور جذبے کے ساتھ منائی گئی مگر اس دفعہ اس تقریب کے رنگ پچھلی بہت ساری تقریبات سے مختلف تھے۔ ترکی، اردن اور متحدہ عرب امارات کے فوجی دستوں اور سری لنکا کے صدر کی تقریب میں شمولیت بھی کوئی نئی خبر نہیں تھی کہ اس سے قبل بھی دوست ممالک کی اعلیٰ شخصیات ایسی تقریبات میں شرکت کرتی رہی ہیں لیکن بھارتی وفد کے ساتھ ملٹری اتاشی کی اس تقریب میں شمولیت کا یہ پہلا موقع تھا۔ بظاہر اس خبر کو کوئی اہمیت دی گئی اور نہ ہی اخبارات میں اس کا زیادہ چرچا ہوا لیکن پاکستان اور بھارت کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کے خطرناک ماحول میں اسے کسی خوش گوار جھونکے سے کم نہیں سمجھنا چاہیے۔

۷۰ سال کے دوران پاک بھارت تعلقات کی بہتری کے لیے کام کرنے والے کم اور نفرتوں کو ہوا دینے والے دھڑے زیادہ تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی ادارے یا فرد نے اگر دونوں ممالک کے درمیان بات چیت یا قیام امن کے لیے دو قدم آگے بڑھائے تو نامساعد حالات کی وجہ سے اسے مزید چار قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ دو خطرناک جنگوں، شدت پسندی اور سرحدی کشیدگی کی وجہ سے جانی اور مالی نقصان اٹھانے کے باوجود لکیر کی دونوں جانب بسنے والوں کے درمیان کئی ایسی ثقافتی، سماجی، لسانی اور علاقائی اقدار مشترک ہیں جو انہیں ایکدوسرے کے ساتھ ملنے کیلیے ہمیشہ بیتاب رکھتی ہیں لیکن ویزے کی بندش اس خواہش کے سامنے سب سے بڑی دیوار ثابت ہوتی ہے۔

ٹریک ٹو ڈپلومیسی کے تحت لگ بھگ پچیس سال قبل ''پاکستان انڈیا پیپلز فورم'' کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا تھا جس کا مقصد فرد سے فرد کا رابطہ، ویزے میں نرمی، سماجی، ثقافتی اور ادبی وفود کا تبادلہ، باہمی تجارت، ڈاک اور ٹیلی فون کی سہولیات میں اضافہ اور دوسرے اہم مسائل کو مدنظر رکھا گیا تھا لیکن پاکستان اور بھارت کے کئی شہروں میں مختلف پروگرام منعقد کروانے، سیکڑوں افراد کی شرکت اور کئی دوسرے متنازعہ امور پر بات کرنے کے باوجود حالات جوں کے توں رہے جنہیں دیکھتے ہوئے قیام امن اور جنگ سے نفرت کرنے والے دھڑے مایوس تو ہوئے مگر کچھ دنوں کی خاموشی کے بعد پھر میدان عمل میں نکل آئے۔

بدلتی ہوئی بین الاقوامی صورت حال میں بھارت نے اپنے پرانے حلیف روس سے بے رخی اختیار کرتے ہوئے امریکہ سے تجارتی، معاشی اور سیاسی تعلقات بڑھانے کا اعلان کیا تو اس خطے کا سیاسی منظر نامہ ہی تبدیل ہو گیا۔ اس تبدیلی اور کشیدگی کی وجہ سی پیک کا منصوبہ بھی تھا جس کی مخالفت میں بھارتی حکومت نے پاکستان کو دنیا میں تنہا کرنے کی دھمکی دی اور سرحدی جھڑپوں میں اضافے کے ساتھ ویزے کی بندش کا مزید سخت فیصلہ کیا۔ ویزے کی یہ بندش ماضی کے مقابلے میں زیادہ سخت اس لیے بھی کہی جا سکتی ہے کہ اس سے نہ صرف پاکستانی شہریوں کو بھارت کے کسی شہر میں جانے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بلکہ یورپ اور امریکہ میں رہنے والے پاکستانی نژاد شہریوں کو بھی ویزا دینے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ بھارت کی وزارت ترقی، انسانی وسائل اور تعلیم کے تحت چلنے والی ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' نے دہلی میں اس ہفتے ایک ادبی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا جس میں دوسرے ممالک کے مندوبین کے علاوہ ڈنمارک میں مقیم اردو زبان کے معروف ادیب و شاعر اور مترجم نصر ملک کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی مگر مندوبین کی انتہائی کوشش اور کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالے کی بہترین تیاری کے باوجود ڈنمارک میں قائم بھارتی سفارت خانے نے انہیں اس کانفرنس کے لیے ویزا دینے سے انکار کر دیا۔

''پاک انڈیا پیپلز فورم'' کی طرح ''سینٹر فار پیس اینڈ پروگریس'' بھی ایک ایسی تنظیم ہے جو دونوں ممالک کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی میں کمی لانے کے لیے کوشاں ہے۔ پاکستان میں اس تنظیم کے مرکزی عہدے دار اور سابق وزیر خارجہ خورشید قصوری نے پچھلے سال اس تنظیم کے تحت بھارت میں منعقدہ ایک کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے دونوں ممالک کے درمیان گفتگو کے عمل کو مسائل کے حل کا بہترین ذریعہ قرار دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ پاکستان کو تنہا کرنے کی بھارتی کوشش انتہائی تباہ کن ہوگی۔ اسی تنظیم کے صدر اوم پرکاش شاہ پچھلے ہفتے پاکستان کے دورے پر آئے تو ان کے خطاب کے دوران دونوں ممالک کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کے سلسلے میں کئی سوالات سامنے آئے لیکن ان کا مرکزی موضوع مسئلہ کشمیر، اس کا حل اور مقبوضہ کشمیر میں جاری پرتشدد کاروائیاں ہی تھا۔ کراچی میں ''عوامی ورکرز پارٹی'' اور ''سوسائٹی فار سیکولر پاکستان'' کے تعاون سے منعقدہ ایک تقریب میں اوم پرکاش شا نے شرکا کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے جو موقف اختیار کیا اس کا لب لباب یہ تھا کہ دونوں ممالک کا میڈیا بعض مسائل کو ضرورت سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے اور مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے جب تک کشمیریوں کو بھی اس کا فریق نہیں بنایا جاتا تب تک کوئی پیش رفت ممکن نہیں۔ وہ یہ بات کہنے میں بھی حق بجانب تھے کہ پاک بھارت کے مسائل اگر جنگ سے ختم ہوتے تو دو بڑی جنگوں کے بعد کوئی بھی مسئلہ باقی نہ رہتا۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ مسائل بات چیت سے بھی حل نہیں ہو رہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم میدان جنگ میں کود پڑیں۔ اگر بات چیت ناکام ہوتی ہے اور اس کے ثمرات نہیں ملتے تو ہمیں مزید بات چیت کرنا چاہیے۔ مسٹر شا کی توجہ مقبوضہ کشمیر سے اٹھنے والے جلوس نما جنازوں اور پرتشدد کاروائیوں کی طرف مبذول کروائی گئی تو ان کا کہنا تھا کہ تشدد تو ہر جگہ ہو رہا ہے جو قطعاً درست نہیں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں بھی قابل مذمت ہیں۔ پاک بھارت تعلقات کی پیچیدہ اور بگڑتی ہوئی صورت حال میں اوم پرکاش شا کا پاکستانی دورہ انتہائی اہم اور مفید کہا جا سکتا ہے مگر اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ پاکستانی حکومت نے کسی اہم اور مرکزی تقریب میں بھارت کے تین اہم سرکاری اہلکاروں کو مدعو کر کے قیام امن کی گیند بھارتی کورٹ میں پھینک دی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بھارت کی طرف سے اس کا کیا جواب آتا ہے۔ ☆☆

''روشن خیالی سے ملائیت تک''

مسلم شمیم

انگریزی روزنامے ''دی نیشن'' کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر ضمیر شیخ کا ۱۴ مارچ ۲۰۱۸ء کو انتقال ہوا ان کی کتاب ''روشن خیالی سے ملائیت تک'' ان کی وفات سے چند ہفتے قبل چھپی تھی اور تین مارچ ۲۰۱۸ء کو اس کی تقریب اجرا کراچی پریس کلب میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کتاب میں شامل میری تحریر بعنوان سیکولرازم پر ایک اجمالی نظر'' قارئین کی نذر ہے۔

ضمیر شیخ کی کتاب ''روشن خیالی سے ملائیت تک'' تاریخ کے ایک خاص مرحلے اور موڑ پر آئی ہے یعنی قیام پاکستان کی ستر سالہ گولڈن جوبلی کے موقع پر یہ کتاب بائیں بازو کے ایک عظیم دانشور اور رہنما جناب معراج محمد خان کے نام ہے بقول صاحب کتاب جنہوں نے پاکستانی سیاست کی سیاہ راتوں میں سیکولر اقدار کے چراغ جلائے اور روشن خیالی کو قائم رکھنے کے لیے بیمثال قربانیاں دیں انتساب کے یہ الفاظ پوری کتاب کے نفس مضمون اور موضوعات زیر بحث کی ترجمانی کرتے ہیں میرے نزدیک یہ ایک نہایت وقیع کتاب ہے اور قارئین کے استفادے کے لیے بھرپور مواد کی حامل ہے اور جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے وہ کسی جانبداری کے رویے کے تحت نہیں ہوا ہے۔ یہ ایک صاحب نظر تاریخ شناس قلم کار کا کارنامہ ہے جسے ضمیر وقت کی آواز کہا جاسکتا ہے اور ساتھ ہی روح عصر کی پکار بھی قرار دیا جاسکتا ہے

پاکستان کی ستر سالہ تاریخ کا سرسری نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ عرصہ تاریخ ترقی معکوس کے زمرے میں آتا ہے جمہوریت اور سیکولرازم لازم وملزوم اصطلاحات ہیں قیام پاکستان کے روز اول سے اس پر مختلف حربوں اور بدنیتی پر مبنی حکمت عملیوں سے جمہوریت پر شب خون مارنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ زیر نظر کتاب میں ان تمام مذہبی جماعتوں اور تحریکوں کا بیان کیا گیا ہے جنہوں نے تحریک پاکستان کی بھرپور کی پاکستان کو ناپاکستان کہا، بانی پاکستان کو کافر اعظم کے نام سے یاد کیا گیا جن مذہبی جماعتوں نے تحریک پاکستان کی بھرپور اور شدت سے مخالفت کی ان میں جماعت اسلامی، جمعیت علمائے ہند، احرار اسلام ہند اور خاکسار تحریک شامل فہرست ہیں سیکولر جمہوریت کی بیخ کنی اور اس پر شب خون مارنے کا سہرا سب سے پہلے چودھری محمد علی کے سر ہے جو میرے نزدیک آمریت جو پہلے سول بیوروکریسی کی زیر قیادت اور بعد میں فوج کی زیر قیادت قائم ہوئی اس کے سرغنہ اول (Chefe acrchitect) چودھری محمد علی تھے جنہوں نے خود کو بانی پاکستان قائداعظم سے حکومت پاکستان کا سیکریٹری جنرل متعین کروایا اور ساتھ ہی خود کو کیبنٹ سیکریٹری کے منصب پر فائز کروایا اس کی تفصیل چودھری محمد علی نے اپنی کتاب "Emergence of Pakistan" میں بیان کی ہے جو ۱۹۶۷ء میں چھپی تھی یہ دونوں عہدے ان کی ذات سے مخصوص رہے اور جب وہ سیاسی منصب یعنی وزارت پر فائز ہوئے تو یہ دونوں عہدے ختم کردیئے گئے مذکورہ دونوں عہدوں کے باوصف گویا عنان حکومت ان کے ہاتھوں میں رہی اور خود ان کے بقول وہ مرحوم وزیراعظم لیاقت علی خان کے ساتھ ہر مرحلے اور ہر مقام پر سائے کی طرح ساتھ رہے بحیثیت سیکریٹری جنرل حکومت پاکستان کے تمام دیگر وزارتوں کی سیکریٹریز کی فائلیں وزیراعظم یا کابینہ تک ان کے وسیلے سے پہنچتی تھیں اور کیبنٹ سیکریٹری کی حیثیت سے کابینہ کے تمام امور میں وہ دخیل تھے اور ان کا کلیدی کردار تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا برحق ہوگا کہ مرحوم لیاقت علی خان DejuroP.M تھے چودھری محمد علی DefactoP.M یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی بحیثیت صدر دستور ساز اسمبلی ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر جو تحریر شدہ اور گہرے غور وفکر کا نتیجہ تھی اس کو سنسر کرکے اس کے سیکولر حصے کو حذف کرنے کا منصوبہ بنایا گیا جس کے چودھری محمد علی سرغنہ تھے یہ تقریر سنسر ہوئے بغیر چھپی جس کا تمام تر کریڈٹ اس وقت کے روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر جناب الطاف حسین مرحوم کے سر ہے اس کی تفصیل مرحوم ضمیر نیازی نے اپنی معروف کتاب Press in Chain میں لکھی۔ اس تقریر کے سیکولر حصے کو حذف کرنے کا منصوبہ دراصل سیکولر جمہوری نظام کے خلاف پہلا بڑا شب خون کا عمل تھا چودھری محمد علی جو بعد میں وزیراعظم بنے اور جو ۱۹۵۶ کے آئین کے خالق کہے جاسکتے ہیں جس کی بنیاد پر سابق مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان Parity کی بنیاد استوار کی گئی تھی یعنی ۵۵ فیصد آبادی والے صوبے کو اکثریت سے محروم کرکے اور مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ون یونٹ میں تبدیل کرکے ایک طرف مغربی پاکستان کو وسیع تر پنجاب بنادیا گیا اور دوسری طرف سابق مشرقی پاکستان کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو جمہوری حقوق سے محروم کردیا گیا اور مذکورہ آئین کے تحت پاکستان کو اسلامی جمہوری قرار دیا گیا۔ چودھری محمد علی نے بعد میں نظام اسلام پارٹی قائم کی۔ ۱۱/اگست ۱۹۴۷ کی تقریر کی سیکولر جمہوری روح کی بیخ کنی قرارداد پاکستان کے ذریعے شروع کی گئی اس قرارداد کی تصنیف وتالیف کے کارنامے میں پس پردہ ہاتھ چودھری محمد علی کا تھا جنہوں نے وزیراعظم لیاقت علی خان کے ذریعہ دیگر مذہبی رہنماؤں کے عملی تعاون سے اسے انجام دیا۔

۱۱/اگست کی تقریر کی خصوصی اور تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے قائداعظم نے دوقومی نظریے کے منطقی خاتمے کا گویا اعلان کیا تھا کیونکہ پاکستان کے وجود میں آجانے کے نتیجے میں پاکستانی ریاست کے ساتھ گویا ایک نئی قوم 'پاکستانی قوم' وجود میں آئی جس کے حوالے سے قائداعظم نے غیر مبہم الفاظ میں ریاست کے تمام شہریوں کو ہر اعتبار سے برابری کا منصب اور برابری کے حقوق کی وضاحت کردی تھی اور ان کا یہ فقرہ "Religion has nothing to do with business of the state" یعنی ریاستی امور میں مذہب کا کوئی کردار اور عمل دخل نہیں ہونا چاہیے یہ فقرہ سیکولر جمہوریت کی مختصر ترین تعریف ہے اور یہی قائداعظم کا تصور پاکستان ہے۔ اس تصور پاکستان کی مرحلہ وار نفی کی جاتی رہی جس کا آغاز قرارداد پاکستان سے ہوا تھا قرارداد پاکستان کے بطن سے بعد میں نظریہ پاکستان کا ظہور ہوا جس کے ظہور پذیر ہونے کا بیان تاریخی مواد کے

ساتھ جسٹس منیر کی کتاب "From jinnah to Zia" میں کیا گیا ہے جو بڑی معنویت کا حامل ہے یہ کتاب جسٹس منیر مرحوم نے ادائے کفارہ کے طور پر لکھی کیونکہ ان کے نظریہ ضرورت کے تحت جمہوریت دشمن آئینی فیصلے نے جمہوری عمل اور جمہوری سفر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا نظریہ پاکستان کا ظہور ۱۹۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی دور میں ہوا اور جس کے ذریعہ اسلامی جمہوریہ پاکستان یعنی پاکستان کے اسلامی ریاست ہونے کا نظریاتی جواز فراہم کیا گیا یہ بات ذہن نشین رہے کہ صدر ایوب نے ۱۹۶۲ء کے آئین میں لفظ اسلامی حذف کر کے صرف جمہوریہ پاکستان کا نام دینے کی جرات کی یہ ایوب خان کے سیکولر ذہن کا اظہار تھا جس کی مذہبی حلقوں کی طرف سے مخالفت کی نتیجے میں ۱۹۶۲ء میں آئین میں دوبارہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا اندراج کیا گیا گویا ایوب خان مذہبی جماعتوں اور حلقوں کی مخالفت کی تاب زیادہ دیر لانے کی اہلیت سے محروم تھے۔

ریاست پاکستان کے آئین کی تدوین یعنی آئین سازی کی کہانی کیساتھ وہی سلوک روا رکھا گیا جو جمہوری عمل کے ساتھ روز اول سے رکھا گیا تھا اور جس کے نتیجے میں پہلا آئین ۱۹۵۶ء میں آیا یعنی قیام پاکستان کے نو سال بعد یہ مرحلہ آیا جبکہ ہندوستان کا آئین ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ ہوا اور جب سے اس آئین کے تحت وہاں کا جمہوری سفر جاری ہے یہاں یہ بیان بے محل نہیں کہ ہندوستان میں سیکولر جمہوریت وقت کے ساتھ زوال پذیر ہوتی گئی اور سیکولر مدبر جواہر لال نہرو کی جگہ آج آر ایس ایس کی پیداوار بی جے پی کی حکومت کی قیادت نریندر مودی کی ہے جو بانگ دہل رام راج اور ہندوتوا کے پرچارک ہیں اور بھارت کو سیکولر ریاست کے بجائے ہندو ریاست کا روپ دینے کی راہ پر گامزن ہین ان جملہ ہائے معترضہ کے بعد پاکستان میں آئین سازی کے مراحل کا بیان پیش نظر رہے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کی عمر بڑی مختصر رہی یعنی ۷ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کو پہلے باضابطہ مارشل لا کے اعلان کے ساتھ اس کے انتقال پر ملال کا اعلان بھی ہوا ملک ۱۹۴۷ء کے بعد سے جس سیاسی عدم استحکام کا شکار رہا اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس دورانیے میں یکے بعد دیگر سات وزرائے اعظم ایوان اقتدار میں آئے اور گئے۔ ان میں محمد علی بوگرہ کو دوبار مسند نشینی حاصل ہوئی اور ان کی دوسری کابینہ میں اس وقت کے فوج کے سربراہ یعنی Serving general ایوب خان کو وزارت دفاع کا منصب سونپا گیا جسے کسی حوالے سے مملکت کے بنیادی قوانین یعنی آئین کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ آئین شکنی کا کھلا مظاہرہ کیا گیا تھا یہ سب کچھ اس وقت کی سول بیوروکریسی کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا۔

مذکورہ سیاسی عدم استحکام بالفاظ دیگر افراتفری کے نتیجے میں معاشرہ جس قسم کی بے یقینی سے دوچار تھا اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہونا چاہیے چنانچہ ۱۹۵۸ء کے مارشل کے اعلان کا عوام میں وقتی طور پر خیر مقدم کیا گیا جسے جمہوریت کے سفر کا المناک مرحلہ کہنا چاہیے اور اسے عوام کی طرف سے سیاسی قیادت سے شدید مایوسی کا اظہار سمجھنا چاہیے مگر یہ دور مختصر رہا اور ایک عشرے سے کم مدت میں پہلا ملک گیر انتخاب ہوا ون یونٹ کا خاتمہ بھی اسی تحریک کے نتیجے میں ہوا تھا مگر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے نتیجے کو اسٹبلشمنٹ نے تسلیم کرنے سے انکار کر کے ملک کی سالمیت کو داؤ پر لگایا اور نتیجتاً مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا۔ زیر نظر کتاب میں اس تاریخی سانحے کے اسباب وعلل کے بیان کے ساتھ اس عہد تاریخ کا منظر نامہ بھی بڑی سیاسی بصیرت کے ساتھ جناب ضمیر شیخ نے پیش کیا ہے۔

یہ کتاب قارئین کے لیے جدوجہد آزادی کے پس منظر سے لے کر انیسویں صدی کے آخری عشرے سے صفحہ تاریخ پر نمودار ہونے والے تمام سیاسی واقعات تحریکیں اور مختلف سیاسی اور مذہبی حلقوں کے کردار کا بیان اختصار مگر بھرپور سیاسی شعور وادراک کے ساتھ کیا گیا ہے اور بیسویں صدی کے آغاز سے قیام پاکستان تک کے تاریخی مراحل کا بیان جس سیاسی شعور وبصیرت سے کیا گیا ہے اسے صاحب کتاب کی ژرف نگاہی کہا جائے گا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی پس وپیش نہیں کہ قائداعظم کا تصور پاکستان جو غیر مبہم الفاظ میں سیکولر جمہوری پاکستان کا نظریہ تھا اسے ان مفاد پرست حلقوں نے مرحلہ وار تاریخ کا حصہ بنا دیا بلکہ صفحہ تاریخ سے ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی بانی پاکستان کی تقریر کو محو کرنے کی کوشش میں کمی روا نہیں رکھی گئی یہاں یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ پاکستان مخالف مذہبی جماعتوں نے مملکت کی سول بیوروکریسی کے تعاون سے قائداعظم کے سیکولر جمہوری پاکستان کو ان کی وفات کے بعد ہائی جیک کر لیا اور وقت کے ساتھ روشن خیالی کی جگہ ملائیت نے بھیانک روپ میں ملک ومعاشرہ کا چہرہ مسخ کر کے مذہبی جنون اور انتہا پسندی کے گرداب میں اسیر کر دیا اور ملائیت جسے مفکر پاکستان علامہ اقبال نے اپنے متعدد اشعار میں پرزور الفاظ میں مسترد کیا تھا وہ وقت کے ساتھ تمام تر تعقل پسندی اور خرد افروزی کی قاتل بن گئی اور راسخ العقیدگی کی ظلمت پھیلانے کے عمل کے لیے باضابطہ حکمت عملی کی راہ اپناتے ہوئے بنیاد پرستی کی نئی نئی تفسیریں اور تعبیریں سامنے لائی گئیں اور آج پاکستانی معاشرہ جن بحرانوں اور عدم استحکام سے دوچار ہے اسی بنیاد پرستی کا شاخسانہ ہے اور انگنت تنظیمیں سامنے آئی ہیں اور آرہی ہیں اور پاکستان کو مختلف نوعیت کی مذہبی انتہا پسندی اور جنون کے دام میں قید کرنے کا سفر شروع کر دیا گیا ہے جس سے ملک کی جامعات بھی محفوظ نہیں رہی ہیں صاحب کتاب نے اس تصنیف وتالیف کے ذریعے اپنی فکر وشعور کی روشنی پھیلانے کا بڑا بامعنی کارنامہ انجام دیا ہے اور وہ فکر وشعور سیکولر جمہوری فکر ہے۔ پاکستان کا مستقبل اسی فکر سے وابستہ ہے اور یہی فکر ستر سالہ سفر انحراف کا سفر ہے جس کے نتیجے میں پاکستانی معاشرہ اندھیروں میں گھرتا جارہا ہے۔ مرحوم ضمیر شیخ نے اپنی مذکورہ کتاب کی آخری سطور میں اپنی رجائیت کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے یہ اختتامی جملے لکھے:

''اس سب کے باوجود عقلی استدلال، ہمہ دینی افکار اور عظیم انسانی قدروں پر یقین رکھنے والا ایک کشادہ نظر طبقہ آج بھی موجود ہے اگر حالات اور عوام نے اس روشن خیال طبقے کا ساتھ دیا تو پوری امید ہے کہ پاکستان قائداعظم کے سیکولر تصور ریاست کے حامل پیغام کو لے کر آگے بڑھے گا اور عام آدمی کی حمایت سے انتہا پسندی کا بت پاش پاش ہو جائے گا اور سیکولر افکار کے ثمرات سے معاشرے میں محبت، یگانگت، مذہبی رواداری، سماجی انصاف اور مساوات کا بول بالا ہوگا۔ یہی امید پاکستان کے تابندہ مستقبل کی ضمانت ہے۔'' ☆☆

ایک نظر

(اس عنوان کے تحت ہم عوامی ورکرز پارٹی کی ملک بھر میں جاری سیاسی وسماجی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں)

(ترتیب وتدوین: عابد شکیل فاروقی)

☆ عوامی ورکرز پارٹی گلگت بلتستان/ اسلام آباد کے زیر اہتمام ایک فکری نشست 25 فروری 2018، پارٹی کے مرکزی سیکریٹری اطلاعات کامریڈ فرمان علی کی رہائیش گاہ پر منعقد ہوئی، اسلام آباد میں رہائش پذیر گلگت بلتستان کے کامریڈز نے نشست میں بھرپور طریقے سے شرکت کی، اجلاس میں گلگت بلتستان میں پارٹی ڈھانچے، مستقبل کی منصوبہ بندی اور سرگرمیاں پر سیر حاصل گفتگو کی، اجلاس کے اہم ترین شرکاء میں کامریڈ فرمان علی، کامریڈ شیر افضل، کامریڈ ایڈووکیٹ نذیر، کامریڈ کلیم، کامریڈ رضوان، کامریڈ مراد، کامریڈ سید تاجک اور کامریڈ آصف سکھی شامل تھے۔

☆ خواتین کے عالمی دن کی مناسبت سے عوامی ورکرز پارٹی لاہور نے 8 مارچ کو ایک تقریب کا انعقاد کیا، جسمیں پارٹی کی مرکزی نائب صدر کامریڈ عابدہ چوہدری، لاہور پارٹی کے اراکین، اور لاہور پارٹی کے عہدیداران، سیاسی کارکنان کے علاوہ شہر کی ممتاز سماجی وسیاسی شخصیات نے شرکت کی، تقریب کے علاوہ پارٹی نے شہر کی مصروف شاہراہوں پر، خواتین کے عالمی دن کی مناسبت سے ایک ریلی کا اہتمام بھی کیا۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی ملتان کے زیر اہتمام خواتین کے عالمی دن کے موقع پر 8 مارچ کو ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا، تقریب کو انسانی حقوق کی چمپین خاتون وکیل عاصمہ جہانگیر کی شخصیت اور انکی جدوجہد سے موسوم کیا گیا، تقریب کی مہمان خصوصی پارٹی کی مرکزی فنانس سیکریٹری کامریڈ شازیہ خان تھیں، تقریب میں ضلع ملتان کی پارٹی کے عہدیداروں اور کارکنوں نے بھرپور طریقے سے شرکت کی۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی سانگھڑ کے زیر اہتمام خواتین کے عالمی دن کے موقع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا، تقریب میں ضلع کی نمائندہ خواتین نے شرکت کی، جبکہ تقریب کے مہمان خاص پارٹی کے مرکزی کسان سیکریٹری کامریڈ حسن عسکری تھے جنہوں نے شرکاء سے موضوع کی مناسبت سے خطاب کیا۔

☆ خواتین کے عالمی دن کی مناسبت سے دیگر شہروں کی طرح عوامی ورکرز پارٹی کراچی نے 10 مارچ کو شہر میں ایک تقریب کا انعقاد کیا، تقریب کو انسانی حقوق کی علمبردار خاتون وکیل محترمہ عاصمہ جہانگیر کے نام سے موسوم کیا گیا تھا اور اسی مناسبت سے تقریب کا عنوان ''انقلابی پارٹی کی تعمیر میں خواتین کا کردار'' تفویض کیا گیا تھا۔ تقریب سے خاتون وکیل محترمہ عبیرہ اشفاق نے خواتین کے قانونی حقوق اور انکے حصول کے حوالے گفتگو کی، جبکہ مہ ناز صاحبہ نے عام گھریلو اور پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین کے جملہ مسائل بشمول انکی صحت کے مسائل، کی مناسبت سے گفتگو کی جبکہ صادقہ صلاح الدین نے تعلیم کے شعبے میں درپیش مسائل اور مشکلات، جن کا آج کی عورت کو سامنا کرنا پڑتا ہے، پر گفتگو کی۔ تقریب سے محترمہ شیما کرمانی نے خطاب کرتے ہوئے محترمہ عاصمہ جہانگیر کی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کیا انکے بقول ہمیں بائیں بازو کی سیاست کرتے ہوئے اپنے کردار اور عمل سے اپنی سیاسی فکر اور نظریات کا مکمل نمونہ نظر آنا چاہیئے، عوامی ورکرز پارٹی کے سینئر نائب صدر یوسف مستی خان نے اپنی گفتگو میں شرکاء سے عمومی سیاسی صورتحال اور بائیں بازو کی جدوجہد پر روشنی ڈالی، کراچی پارٹی کے سیکریٹری کامریڈ شفیع شیخ نے ملکی سیاست میں عام خواتین کی عدم دلچسپی اور عدم شرکت کو معاشرتی تبدیلی کی جدوجہد کی سست روی سے جوڑتے ہوئے صورتحال کا تجزیہ پیش کیا، تقریب کے آخر میں پروگرام کی صدر کامریڈ اقبال سلطانہ نے خطاب کرتے ہوئے ملکی سیاست میں خواتین کے کردار، اپنی سیاسی جدوجہد، بائیں بازو کی سیاست میں خواتین کے مختلف رجحانات کے حوالے سے گفتگو کی، انہوں نے کراچی پارٹی کو مبارکباد دی کہ خواتین کے حوالے سے اتنے کامیاب پروگرام کا انعقاد کیا، آخر میں انہوں نے تمام مقررین اور شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی سندھ کے ساتھیوں نے نوڈیرو شہر اور لیبر کالونی میں محنت کش ساتھیوں سے ملاقات کی، اس موقع پر نوڈیرو شہر اور لیبر کالونی میں پارٹی کے نئے یونٹس قائم کئے گئے، ساتھی زاہد حسین کلر نوڈیرو شہر اور ساتھی برکت سموں کو لیبر کالونی یونٹ کا سیکریٹری مقرر کیا گیا، اس موقع پر پارٹی کے صوبائی نائب صدر کامریڈ اثر امام صوبائی لیبر سیکریٹری کامریڈ روشن کلہوڑو، ضلع لاڑکانہ پارٹی کے نائب صدر کامریڈ مجیب پیرزادہ، ضلعی سیکریٹری اطلاعات کامریڈ اسرار نوناری، نے خصوصی طور پر شرکت کی اور شرکاء سے سیاسی صورتحال، پارٹی کے منشور اور پروگرام پر تفصیلی بات چیت کی۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی سندھ اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے ساتھیوں نے رتو ڈیرو میں محنت کش ساتھیوں سے ملاقات کی، اس موقع پر رتو ڈیرو میں پارٹی کا یونٹ قائم کیا گیا، ساتھی منیر لنجھر کو رتو ڈیرو شہر کے پارٹی یونٹ کا سیکریٹری مقرر کیا گیا اس ملاقات میں پارٹی کے صوبائی نائب صدر کامریڈ اثر امام صوبائی لیبر سیکریٹری کامریڈ روشن کلہوڑو، ضلع لاڑکانہ پارٹی کے نائب صدر کامریڈ مجیب پیرزادہ، ضلعی سیکریٹری اطلاعات کامریڈ اسرار نوناری اور اسلام آباد سے آئے ہوئے پارٹی کے سینئر ساتھی ملک رفیق بھی شریک ہوئے اور محنت کشوں سے سیاسی صورتحال، پارٹی کے منشور اور پروگرام پر تفصیلی بات چیت کی۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی ضلع لاڑکانہ پارٹی کے رہنماؤں، نائب صدر کامریڈ مجیب پیرزادہ، ضلعی سیکریٹری اطلاعات کامریڈ اسرار نوناری، کامریڈ منور

سندیلو (سیکریٹری باڈہ) کامریڈ منیر کنبھر (سیکریٹری رتو ڈیرو یونٹ) نے یکم مارچ کو لیبر کالونی لاڑکانہ میں مختلف کارخانوں اور ملوں کے محنت کشوں کے ساتھ ملاقات کی جسمیں میں موجودہ سیاسی صورتحال ، پارٹی کے منشور اور پروگرام اور پارٹی کی طرز سیاست کا تعارف پیش کیا گیا، اس موقع پر نو ساتھیوں نے پارٹی میں شمولیت کا باقاعدہ اعلان کیا، اس موقع پر پارٹی کے صوبائی نائب صدر کامریڈ اثر امام صوبائی لیبر سیکریٹری کامریڈ روشن کلہوڑو بھی موجود تھے۔

☆ نوڈیرو شہر میں 21 مارچ کو منعقد کئے گئے بھٹہ مزدوروں کے پروگرام میں پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری کامریڈ روشن کلہوڑو، کامریڈ مرتضی کورائی، کامریڈ اسرار نوناری، کامریڈ زاہد کلر، کامریڈ اسد علی راہوجو، اور دیگر کامریڈ ساتھیوں نے شرکت کر کے بھٹہ مزدوروں کے مسائل پر بات چیت کی اور انکی یونین سازی میں ان کی مدد کی۔

☆ سوسائٹی فار سیکیولر پاکستان اور عوامی ورکرز پارٹی کے زیر اہتمام مورخہ 22 مارچ کو ''سیکیولرازم کو درپیش چیلینجز اور بھارت پاکستان تعلقات'' کے موضوع پر کراچی مرکزی سیکریٹریٹ میں ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں بھارت سے آئے ہوئے مہمان ،چیئرمین سینٹر فار پیس اینڈ پروگریسو انڈیا، ''اوم پرکاش شاہ''، عوامی ورکرز پارٹی کے سیکریٹری جنرل اختر حسین ،انسانی حقوق کی محترمہ انیسہ ہارون، ڈاکٹر ہارون ، اور ممتاز دانشور اور کالم نویس جناب بابر ایاز نے موضوع کی مناسبت سے تقریب کے شرکاء سے خطاب کیا، تقریب کی میزبانی ، پارٹی کے سیکریٹری کامریڈ اختر حسین نے کی جنہوں نے موضوع کی مناسبت سے انڈو پاک تعلقات پر اثر انداز ہونے والے ریاستی اور غیر ریاستی عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے علاقائی صورتحال کا مختصر تجزیہ پیش کیا، جناب بابر ایاز نے دونوں ممالک کے مذہبی عناصر اور سرگرمیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان عوامل کا ذکر کیا جو دونوں ممالک اور انکے عوام پر منفی انداز میں اثر انداز ہوتے ہیں ڈاکٹر ہارون احمد اور محترمہ انیسہ ہارون نے اپنے اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں موضوع پر اظہار خیال کیا سب سے آخر میں مہمان خصوصی جناب اوم پرکاش شاہ نے اظہار خیال کیا جنکے خطاب کے بعد حاضرین کو سوالات پوچھنے کی دعوت دی گئی جس کے دوران شرکاء کی پروگرام میں دلچسپی کا اظہار ان کی طرف سے پوچھے گئے سوالات سے محسوس کیا گیا، جنہوں نے سیاست، مذہب، ثقافت، زبان، رسم ورواج اور ریاستی تعلقات کے حوالے سے جناب اوم پرکاش شاہ سے لاتعداد سوالات کئے ، سوالات کے سیشن کے بعد پروگرام کے شرکاء کی چائے سے تواضع کی گئی۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی لاہور نے 26 مارچ کو چیرنگ کراس پر پورے پنجاب سے آنے والی لیڈی ہیلتھ ورکرز کے دھرنے میں شرکت کر کے ان ساتھ اظہار یکجہتی کا اظہار کیا ،جسمیں ملتان اور لودھراں سے بھی پارٹی کی خواتین اراکین نے شرکت کی، دھرنے کے شرکاء سے گفتگو کے ذریعے پارٹی کی مرکزی نائب صدر کامریڈ عابدہ چوہدری نے بتایا کہ ان لیڈی ورکرز کو ہفتے کے ساتوں دن بغیر کسی چھٹی کے اپنی ڈیوٹی انجام دینی پڑتی ہے اگرچہ یہ تمام ورکرز 2012 سے ریگولر ہیں مگر نہ انکو انکے بقایا جات ادا کئے جارہے ہیں نہ انکی ماہانہ تنخواہ وقت پر ادا کی جاتی ہے، دوران کار انکو طبی سہولیات کی فراہمی بھی معطل ہے اور دوران کار سائلین سے رابطے کی غرض سے مہیا کئے گئے موبائل فون کے اخراجات ادا نہیں کیے جاتے ہیں۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی لیبر کالونی لاڑکانہ یونٹ اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے زیر اہتمام کامریڈ جام ساقی کی یاد میں ایک تعزیتی ریفرنس مورخہ 31 مارچ 2018 نظامانی لیبر ہال لاڑکانہ میں منعقد ہوا جسکی صدارت عوامی ورکرز پارٹی صوبہ سندھ کے نائب صدر کامریڈ اثر امام نے کی جبکہ پارٹی کے صوبائی لیبر سیکریٹری کامریڈ روشن کلہوڑو مہمان خصوصی تھے، دیگر مہمانان گرامی میں عوامی ورکرز پارٹی ضلع لاڑکانہ کے نائب صدر کامریڈ مجیب پیرزادہ ،ضلعی سیکریٹری اطلاعات کامریڈ اسرار نوناری، کامریڈ احمد علی، رحیم چنا، کامریڈ نیاز جمالی، عیسیٰ میمن، منیر کنبھر اور دیگر شامل تھے۔اس موقع پر عوامی ورکرز پارٹی کے سات یونٹس باڈہ، بلہڑ بیجی، لیبر کالونی لاڑکانہ، ماہوڑ، رتو ڈیرو، نو ڈیرو، لیبر کالونی نو ڈیرو، کے ساتھیوں کے علاوہ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے کارکنان بھی شریک ہوئے ، تقریب سے مقررین نے کامریڈ جام ساقی کی جدوجہد کو سرخ سلام پیش کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ ملکی سیاسی صورتحال اور محنت کش طبقات کی حالت زار پر روشنی ڈالی اور عوامی ورکرز پارٹی میں شامل ہو کر نجات کا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دی۔

☆ ایسوسی ایشن آف انڈین کمیونسٹ برطانیہ، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کی برطانوی شاخ کی اٹھارویں کانگریس کے اوپن سیشن کے موقع پر عوامی ورکرز پارٹی کے ایک وفد کی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (ماکسسٹ) کے جنرل سیکریٹری کامریڈ سیتا رام یچوری سے مانچسٹر میں ملاقات ہوئی، جسمیں دونوں پارٹیوں کے درمیان تعلقات بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا۔کانگریس سے سی پی آئی (ایم) کے عہدداروں کے علاوہ عوامی ورکرز پارٹی برطانیہ کے رہنماء کامریڈ پرویز فتح نے بھی خطاب کیا، تقریب کے بعد دونوں پارٹیوں کے وفود کے درمیان باقاعدہ مذاکرات ہوئے جن میں دونوں ممالک کی سیاسی صورتحال ، مارکسی پارٹیوں کی سیاست اور انکی حقیقی قوت، دونوں ممالک میں بالخصوص انڈیا میں مذہبی انتہاپسندی کی بڑھتی ہوئی لہر اور دونوں پارٹیوں کے درمیان تعلقات کو نئے سرے سے استوار کرنے کے علاوہ ریجن کی مارکسی پارٹیوں کی ایک وسیع تر کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ ہو، عوامی ورکرز پارٹی کے وفد میں پرویز فتح، خالد سعید قریشی، ذاکر حسین، پروفیسر نذیر تبسم، محمد ضمیر بٹ اور نصرت علی تور شامل تھے۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی فیصل آباد نے بھگت سنگھ کی شہادت کے دن ان کے آبائی گاؤں میں بھگت سنگھ کی حویلی میں ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ پارٹی ورکرز کی ایک بڑی تعداد نے اس میں شرکت کی پارٹی کے ساتھیوں نے بھگت سنگھ کے اسکول تک جلوس نکالا اسکول میں اور اس کی حویلی میں چراغاں کیا گیا۔ پارٹی کی طرف سے بھگت سنگھ کی زندگی اور اس کی جدوجہد پر ایک پمفلٹ شائع کروا کر تقسیم کیا گیا۔

AWP کے صدر، جنرل سیکریٹری اور صوبائی صدر کا مینگورا میں ہوئے جلسے سے خطاب

AWP ملتان کے زیرِ اہتمام خواتین کے عالمی دن کے موقع پر ایک تقریب

مانچسٹر، برطانیہ میں CPI-(M) اور AWP کے وفود کی ملاقات کے موقع پر لیا گیا گروپ فوٹو

کینیڈا میں مقیم AWP کے کارکنان کی ٹورنٹو میں یومِ خواتین کے موقع پر منعقدہ ریلی میں شرکت

AWP لیبر کالونی لاڑکانہ یونٹ اور PTUF کے زیرِ اہتمام جام ساقی کی یاد میں ایک ریفرنس کا انعقاد

یہ ہم گناہ گار عورتیں ہیں

کشور ناہید

یہ ہم گناہ گار عورتیں ہیں
جو اہلِ جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں
یہ ہم گناہ گار عورتیں ہیں
کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ
وہ سرفراز ٹھہریں
نیابتِ امتیاز ٹھہریں
وہ داورِ اہلِ ساز ٹھہریں
یہ ہم گناہ گار عورتیں ہیں
کہ سچ کا پرچم اٹھا کے نکلیں
تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملے ہیں
ہر ایک دہلیز پہ سزاؤں کی داستانیں رکھی ملے ہیں
جو بول سکتی تھیں وہ زبانیں کٹی ملے ہیں
یہ ہم گناہگار عورتیں ہیں
کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے
تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی
کہ اب جو دیوار گر چکی ہے
اسے اٹھانے کی ضد نہ کرنا
یہ ہم گناہ گار عورتیں ہیں
جو اہلِ جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں نہ ہاتھ جوڑیں